درمیاں کوئی تو ہے

احمد صغیر

یہ کتاب بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے مالی تعاون
سے شائع کی گئی ہے

اس کتاب میں شائع مواد سے بہار اُردو اکادمی، پٹنہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ کسی بھی قابل اعتراض مواد کی اشاعت کے لئے خود مصنف ذمہ دار ہے۔

درمیاں کوئی تو ہے

(افسانے)

احمد صغیر

استعارہ پبلی کیشنز
۵۳،اے.ذاکر باغ،اوکھلا روڈ
نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

"DARMIYAN KOI TO HAI"

(Short Stories)

by : **Ahmad Sagheer**

نام کتاب	:	درمیاں کوئی تو ہے(افسانے)
مصنف	:	احمد صغیر
پتہ	:	ترسیل پبلی کیشنز،F15/9ٹاپ فلور، جوگا بائی ایکسٹینشن جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵
مستقل پتہ	:	منی مسجد، گیوال بیگھہ، گیا-823001(بہار)
سال اشاعت	:	۲۰۰۷ء
تعداد	:	ایک ہزار
کمپوزنگ	:	محمد اقبال قیصر، (کہکشاں کمپوزنگ سینٹر، گیا)
طابع	:	پرنٹ سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی۔۲
سرورق	:	
زیراہتمام:	:	استعارہ پبلی کیشنز، ۵۳،اے.ذاکر باغ، اوکھلا روڈ نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵ ٹیلی فون:۶۳۱۸۱۲۶
قیمت	:	Rs.150.00

تقسیم کار:

- ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔٦
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔٦

- الکتاب، یتیم خانہ کمپلیکس، ارریا۔۸۵۴۳۱۱
- ہندی بک سینٹر، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۔۲
- بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار)
- ترسیل پبلی کیشنز، منی مسجد، گیوال بیگھہ، گیا۔۸۲۳۰۰۱

اپنی شریک حیات

نزہت پروین

کے نام

تعارف

نام : محمد صغیر

قلمی نام : احمد صغیر

والدین : محمد حنیف (مرحوم)، ساجدہ خاتون

پیدائش : ۲۱ر نومبر ۱۹۶۳ء

مولد : محلّہ گیوال بیگھہ، گیا (بہار)

تعلیم : پی ایچ.ڈی (اردو)

ملازمت : سرکاری ملازم

دیگر کتابیں :

- نئی کہانی نیا مزاج (انتخاب اور تجزیہ) 1989
- چھ دسمبر (بابری مسجد پر لکھی گئی نظموں کا انتخاب) 1993
- منڈیر پر بیٹھا پرندہ (افسانوی مجموعہ) 1995
- انّا کو آنے دو (افسانوی مجموعہ) 2001
- جنگ جاری ہے (ناول) 2002
- چنگاریوں کے درمیان (غزلیں — ہندی) 2002
- اردو افسانوں میں احتجاج (تحقیقی مقالہ) 2003

تراجم :

- بے شناخت (اردو سے ہندی) ناصر بغدادی

- تلاش بہاراں* (اردو سے ہندی) کشوری لال نسیم
- پرتی نیدھی شاعری* (اردو سے ہندی) اکبرالہ آبادی
- پرتی نیدھی شاعری* (اردو سے ہندی) شکیب جلالی
- پرتی نیدھی شاعری* (اردو سے ہندی) خواجہ میر درد

[*یہ چاروں کتابیں رادھا کرشن پرکاشن، نئی دہلی سے شائع ہو چکی ہیں]

ترتیب

درمیاں کوئی تو ہے

تھیٹر شہر کے بالکل وسط میں تھا—‘

جس میں کئی مہینوں سے ایک ہی ڈرامہ پیش کیا جارہا تھا۔

ڈرامہ عوام کی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کیونکہ لائٹ اور ساؤنڈ کی مدد سے اسٹیج پر وہ مناظر دکھائے جا رہے تھے جو حقیقت میں ناممکن تھے۔
جب میں نے کئی دوستوں سے اس کی تعریف سنی تو ایک دن اُدھر نکل پڑا۔ تھیٹر کے باہر کافی گہما گہمی تھی۔ ہر طبقے کے لوگ وہاں موجود تھے۔ کچھ لمبے لمبے ٹیکا دھاری، کچھ گیروا کپڑے زیب تن کئے ہوئے، کچھ ملّا ٹائپ لوگ اور کچھ بالکل عام لباس اور عام حلیے میں بھی تھے۔ مجھے ٹکٹ ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ دو ایک شناسا قطار میں پہلے سے کھڑے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مشکل آسان کردی۔
تھیٹر کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی نشست خالی ہو۔ اسٹیج کا پردہ گرا ہوا ہے اور روشنی جاگ رہی ہے۔ لوگ چہ می گوئیاں کر رہے ہیں۔ کوئی تیز آواز میں بول رہا ہے تو کوئی سرگوشی کے انداز میں۔ مدھم روشنی کی وجہ کر کسی کا چہرہ صاف نہیں دِکھ رہا ہے۔
دھیرے دھیرے ہال کی روشنی گل ہونے لگتی ہے اور فضا میں ایک آواز ابھرتی ہے—‘

بہنو اور بھائیو!

ڈرامہ شروع کرنے سے قبل ڈرامہ سے متعلق چند باتیں بتانا ضروری ہیں۔ یہ ڈرامہ ہماری تاریخ کی ایک مختصر سی جھلک ہے جس میں تاریخ کے چند اہم واقعات اور کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ کچھ لوگ اس سے اتفاق کریں گے اور کچھ لوگوں کو اعتراض بھی ہو سکتا ہے۔ مقصد کسی کی تعریف یا توہین نہیں ہے۔ اس لیے ڈرامہ خاموشی سے دیکھیں۔ ڈرامہ کے آخر میں ہم ڈرامہ نگار کو آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ آپ ڈرامہ کے متعلق ان سے کوئی سوال بھی کر سکتے ہیں تو آیئے ڈرامے کا اب آغاز کرتے ہیں۔
اسٹیج کا پردہ دھیرے دھیرے سرکتا ہے۔ اسٹیج پر سفید رنگ کی روشنی بچھ جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ روشنی ماند پڑتی جاتی ہے۔ ایک عورت کا سایہ لہراتا ہے اور ایک نسوانی آواز ابھرتی ہے—’’میں دلّی ہوں!

دلّی یعنی ہندوستان کا دل۔ ہندوستان کا دارالخلافہ!

میں ایسی ابھاگن ہوں جس نے آغاز سے آج تک ظلم وستم... جنگ وجدل... خون... مصیبت... تعصب... اور نہ جانے کیا کیا دیکھا ہے اور دیکھ رہی ہوں۔ میرے دل پر راج کرنے والوں نے کبھی میرے اندر کے درد کو نہیں سمجھا۔ کبھی میرے آنسوؤں کو نہیں دیکھا... انہیں صرف حکومت کرنے سے مطلب رہا ہے۔ انہیں اس کا دھیان بھی نہیں رہا کہ دلّی کا دل پارہ پارہ ہورہا ہے۔ وہ اندر ہی اندر سسک رہی ہے اور نہ جانے کب تک اسے سسکنا پڑے گا—''

ہچکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ سایہ آہستہ آہستہ اسٹیج سے غائب ہو جاتا ہے۔ رنگ برنگی روشنی بکھر جاتی ہے۔ پھر اسٹیج پر صرف سفید روشنی باقی رہ جاتی ہے۔ روشنی کے درمیان ہی ہندوستان کا نقشہ ابھرتا ہے۔ ساؤنڈ ٹریک پر قومی ترانہ گونج رہا ہے۔ نقشہ آہستہ آہستہ غائب ہوتا جاتا ہے۔ تبھی دھوتی پہنے اور لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا کوئی شخص اسٹیج کے ایک کنارے سے نکل کر جیسے ہی اسٹیج کے بیچ میں پہنچتا ہے دوسری طرف سے ایک شخص نکلتا ہے اور کئی گولی اس کے سینے میں اُتار کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہ بوڑھا شخص ''ہے رام'' کی آواز کے ساتھ زمین پر گر کر پران تیاگ دیتا ہے—

پردہ گر جاتا ہے۔

ہال میں ہلکی روشنی اُبھر آئی ہے۔ ہال کے ایک گوشے سے کئی آوازیں ابھرتی ہیں—

''گوڈسے زندہ باد۔''

''گوڈسے امر رہو۔''

دوسرے گوشے سے پُرزور آواز ابھرتی ہے—

''بکواس بند کرو۔ گاندھی کے ہتھیاروں سے ہوشیار... یہ لوگ امن کے دشمن ہیں۔ فرقہ پرستی کا زہر پھیلا رہے ہیں۔ گوڈسے کو ہیرو بنا رہے ہیں۔ یہ عدم تشدد کے دشمن ہیں۔''

مائیک پر پھر اس شخص کی آواز گونجتی ہے۔

''دیکھئے آپ لوگ اس طرح کا مظاہرہ ہال میں نہ کریں۔ ہم تو ڈرامہ دکھا ہی رہے ہیں۔ یہ سب مظاہرے پارلیامنٹ اور اسمبلیوں میں اچھے لگتے ہیں۔

جب آپ لوگ مائکروفون سے ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں۔ ....

ایک دوسرے پر کرسیاں پھینکتے ہیں۔ گتھم گتھی کرتے ہیں۔ کپڑے بھی پھاڑ ڈالتے ہیں۔ اُس وقت ٹیلی ویژن پر یہ مناظر دیکھ کر ہم لوگوں کو تو ہنسی آتی ہی ہے۔ دنیا کے لوگ بھی ہنستے ہوں گے کہ کتنا ترقی یافتہ ملک ہے۔ کتنے مہذب لوگ ہیں—اس لیے یہ سب آپ وہیں کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ یہاں خاموشی سے ڈرامہ دیکھیں بس—'

ہال میں بیٹھے لوگ خاموش ہو جاتے ہیں اور سب کی نگاہیں اسٹیج کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ پردہ دھیرے دھیرے سرکتا ہے۔ اسٹیج پر ایک قدیم عمارت ابھرتی ہے۔ تین پرانی گنبدیں جس پر کائی جمی ہوئی ہے۔ کچھ لوگ اسے مسمار کر رہے ہیں۔ ہر طرف شور اور نعروں کی آوازیں بلند

ہورہی ہیں۔ تین گیروا کپڑا زیب تن کیئے ہوئے نیتا عمارت کوٹوٹتے دیکھ کرمسکرار ہے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے عمارت زمیں بوس ہوجاتی ہے۔ تینوں نیتا ایک دوسرے کے گلے لگ کرخوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

’’آج ہم نے غلامی کی نشانی کوتوڑ دیا‘‘—ایک نیتا دہاڑتا ہے۔

اسٹیج کی روشنی دھیرے دھیرے معدوم ہوتی جاتی ہے۔

ہال میں سناٹا چھاجاتا ہے۔

’’کیا ہماری مسجدیں غلامی کی علامت ہیں‘‘—ایک ملاّ ٹائپ آدمی اپنے بغل میں بیٹھے دوست سے پوچھتا ہے۔

’’مسجد کی کیا بات ہے بھئی—اب تو ہم بھی ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھنے لگے ہیں‘‘—اس نے بیزاری ظاہر کی۔

’’ہاں اسی لیے تو فساد میں پہلے ہمارے گھروں کی نشان دہی کی جاتی ہے اور پھر مارا جاتا ہے‘‘—پہلے والے نے مزید تبصرہ کیا۔

’’لیکن ہمارے لیڈر خاموش کیوں بیٹھے ہیں‘‘—دوست نے ایک سوال اچھالا۔

’’تم انہیں لیڈر کہتے ہو... یہ سب دلال ہیں جو مسلمانوں کا سودا کر کے اپنا مفاد پورا کرتے ہیں‘‘—پہلے والے نے غصے کا اظہار کیا۔

تبھی ہال کی دوسری جانب سے ایک شور اُبھرتا ہے۔

’’مندر وہیں بنائیں گے۔‘‘

’’مسلمانوں کو مسجد کا دعویٰ چھوڑنا ہوگا۔‘‘

’’کاشی اور متھرا بھی حوالے کرنا ہوگا۔‘‘

پھر اسٹیج سے وہی آواز ابھرتی ہے۔

’’دیکھئے آپ لوگ پھر شور شرابہ کرنے لگے... آپ ایودھیا میں مندر بنائیں یا مسجد... ایودھیا کی متنازعہ زمین دان میں مانگیں یا قانون بنا کر حاصل کریں یا عدالت کے فیصلے سے لیں... ایودھیا، کاشی اور متھرا کے لیے مسلمانوں کو دھمکی دیں یا زبردستی چھین لیں۔ ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔ ہم صرف تاریخ کے اہم واقعات کو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اسے خاموشی کے ساتھ دیکھیں۔ بس یہی آپ سے التجا ہے۔‘‘

ہال میں پھر خاموشی چھاجاتی ہے۔

پردہ دھیرے دھیرے سرکتا ہے۔

اسٹیج پر دو گگن چمبی ٹاور نظر آتے ہیں۔ چاروں طرف برقی روشنیوں کی برسات ہے۔ اُس کے آس پاس اور بھی وسیع وعریض عمارتیں دِکھتی ہیں۔ اچانک دو ہوائی جہاز ٹاور سے ٹکراتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ٹاورز میں بوس ہوجاتے ہیں۔

ہال میں پہلے کی طرح خاموشی ہے۔

’’بھائی صاحب! یہ ہالی ووڈ کی کسی فلم کا منظر ہے‘‘—

ایک آدمی نے پاس بیٹھے شخص سے دریافت کیا۔اس آدمی نے آنکھیں تریر کر اُس شخص کو دیکھا۔سوال پوچھنے والا خاموش ہو گیا۔

''سالا ابھی اپنے ملک کا ڈرامہ دکھلا رہا تھا۔اب وِدیش کا دکھانے لگا''—اس کی بائیں طرف کا بیٹھا آدمی گویا بدبدایا— ''اپنے دیش میں ڈرامے کی کمی ہے جو باہر کے ڈرامے دکھا رہا ہے۔''

''بھئی دیکھنے میں حرج ہی کیا ہے۔اپنے ملک کے ڈرامے تو ہمیشہ ہی دیکھتے ہیں۔کچھ باہر کا بھی دیکھنا چاہیے۔''

''ہاں باہر کا ڈرامہ اسی طرح دیکھتے رہے تو اپنے ڈرامے کو بھول جائیں گے—''

''نہیں بھولیں گے کیونکہ ہمارے ملک میں ہر روز ایک نیا ڈرامہ رونما ہوتا ہے—''

''یار آج حوالہ والا ڈرامہ نہیں دکھایا۔کل تو دکھایا تھا۔میرا دوست بتا رہا تھا—''

''آج گودھرا والا ڈرامہ بھی نہیں دکھایا۔میں تو اسی کو دیکھنے کے لیے آیا تھا—''

''اور گجرات والا ڈرامہ بھی نہیں دکھایا— ہوسکتا ہے بعد میں دکھائے۔''

''بھئی کچھ بھی کہو... مجھے تو ٹاور والے ڈرامہ میں مزہ آگیا... ایک ہی جھٹکے میں خلاص''... ایک نوجوان بولا۔

''لیکن اس کا ردِّ عمل برا ہوگا''—اس کے بغل والے نے تشویش ظاہر کی۔

''کرنے والا انجام سے بے خبر نہیں ہوگا۔''

تبھی اسٹیج کے افق پر کئی جہاز اڑتے نظر آتے ہیں... پھر بموں کی آوازیں... چیخ وپکار...

پھر سب شانت ہو جاتا ہے۔

ایک ملاّ نما آدمی اسٹیج پر اُبھرتا ہے۔

''آج میں جن مصنوعات کی فہرست جاری کر رہا ہوں... اس کا استعمال آپ لوگ ہرگز نہ کریں۔یہ ہمارے دشمن کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔یہ ہمارے ہی پیسے سے ہتھیار بنا کر ہم پر استعمال کرتے ہیں۔''

پھر اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

ہال میں چہ می گوئیاں ہونے لگتی ہیں۔

''بھئی یہ ملاّ تو ہر چیز کے استعمال پر پابندی لگا رہا ہے۔''

''یار ان کا یہی کام ہے... لیکن ان کے فتوے پر کتنے لوگ عمل کرتے ہیں... چلو پیپسی پی کر آتے ہیں۔''

''نہیں بھئی ہمیں ملاّ کی بات ماننی چاہیے۔''

''اور اپنے دل کی بات...''

''میرا دل اب میرا کہاں رہا۔یہ تو فتوؤں کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔''

اسٹیج کا پردہ پھر دھیرے دھیرے سرکتا ہے۔اس بار اسٹیج روشنی سے جگمگا جاتا ہے۔ساؤنڈ ٹریک پر پھر وہی آواز ابھرتی ہے—

''آج کا شو یہیں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اگر ہمارا شو اسی طرح کامیابی کی منزلیں طے کرتا ہے اور کہیں نہ کہیں اسی طرح اہم واقعات رونما ہوتے رہے تو ہم اُسے بھی اسٹیج پر پیش کر کے آپ کا منورنجن کریں گے۔ ہم آپ کے شکر گذار ہیں کہ ہمارے ڈرامے کو اتنی خاموشی سے دیکھا اور اس سے لطف اندوز ہوئے... اب ہم آپ کے سامنے ڈرامہ نگار کو پیش کرتے ہیں... تالیاں...''

اسٹیج پر تیز روشنی کے ساتھ ایک آدمی ہاتھ جوڑتا ہوا نمودار ہوتا ہے اور مسکراتا ہوا بیچ میں آ کر کھڑا ہو جاتا ہے، ہال میں پھر کھیاں بھنبھنانے لگتی ہیں۔

''ارے اس کا چہرہ تو جانا پہچانا ہے... ہاں یاد آیا... گاندھی کو مارنے والا تو یہی تھا—''ایک آدمی لگ بھگ چیخ پڑا۔

''نہیں نہیں... بابری مسجد کو ڈھانے والوں میں یہی پیش پیش تھا''—دوسرا شخص تقریباً کھڑا ہو گیا۔

''تم دونوں نے غلط پہچانا... گودھرا کانڈ میں اسی کا تو ہاتھ تھا''— تیسرے شخص نے نیا انکشاف کیا۔

''اور گجرات میں کون تھا... یہ نہیں تھا؟... یہی تھا... اسی نے وہاں بے گناہ لوگوں کو زندہ جلا دیا تھا''—ایک آدمی رونے لگا۔

تبھی ڈرامہ نگار کی آواز ابھرتی ہے—

''آپ لوگ مجھے دیکھ کر اس قدر حیران کیوں ہیں۔ میں تو آپ ہی کے بیچ کا آدمی ہوں... ہر پل... ہر لمحہ... ہر سمے آپ کے ساتھ رہتا ہوں... اور آپ کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتا ہوں... آپ کے جذبات سے کھیلتا ہوں... اور آپ محض تماشائی بنے رہتے ہیں... کیونکہ آپ تماشہ دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور تماشہ بنانا میرا پیشہ... تو آج کا تماشہ یہیں ختم کرتا ہوں۔ کل پھر کسی موڑ... کسی گلی... کسی ڈگر... کسی گاؤں... کسی شہر میں کوئی نیا بھیش بدل کر آپ سے ملاقات ہوگی... تب تک کے لیے جے ہند!

●●

تعفن

دھوپ میں لت پت تھکا دن، چاکلیٹی شام کی گود میں سر رکھ کر گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔فضا پر دھندلکا طاری ہو رہا تھا اور شہر بھر کے گندے محلے کے سڑتے ہوئے کوڑے کے ڈھیر سے دماغ تک کو گھٹن میں مبتلا کر دینے والے تعفن کا بھبھکا شام کی سرد ہوا کے ساتھ دور دور تک پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ یوں تو دن بھر اس کوڑے سے تعفن کے جھونکے اٹھتے رہتے تھے لیکن شام ہوتے ہوتے اس کی بدبو میں مزید اضافہ ہو جاتا مگر مُنوا کی زندگی میں ان بدبوؤں کے سونگھتے رہنے اور کچرا بینے کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔شام ہوتے ہوتے اس کا بوسیدہ بورا کچرے سے بھر جاتا۔گندی بوتلیں، استعمال شدہ پولوتھین، ٹین کے ڈبے، شیشے کے ٹکڑے اور مختلف بظاہر بے کار چیزوں سے اس کا بورا بھاری نظر آنے لگتا۔تب وہ سیدھا کباڑی کی دُکان پر پہنچتا۔اُسے فروخت کرتا اور پیسے لے کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ماں اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی کہ کب وہ پیسہ لے کر آئے کہ چولھا گرم ہو۔منوا بورا کو ایک طرف ڈال کر بنیئے کی دُکان پر پہنچ جاتا، آدھا کیلو آٹا، سو گرام دال، ۵۰ گرام تیل، نمک، مرچ اور ہلدی لا کر ماں کو پکڑا دیتا۔ٹی۔بی زدہ ماں دن بھر چن کر لائی ہوئی لکڑیوں سے چولھا گرم کرتی اور توا اس پر ڈال دیتی۔منوا باہر کے ہینڈ پمپ پر ہاتھ منہ دھونے کے لیے چلا جاتا۔واپس آ کر اسی بوسیدہ بورے کو بچھا کر بیٹھ جاتا جس میں سامان بین کر کے رکھتا تھا—'

مُنوا کا باپ رکشہ چلاتا تھا اور اپنی کمائی کا آدھا حصہ شراب میں صرف کرتا تھا۔آدھے پیسے سے پھُلوا کی دوا آتی یا جھونپڑی کا کرایہ ادا ہوتا تھا۔ لالٹین کی مدھم لرزتی ہوئی روشنی میں پھُلوا آدھا کچا آدھا پکا کھانا منوا کو پروس دیتی۔وہ جلدی جلدی کھانے کو حلق سے نیچے اُتارتا اور اسی بورے پر اپنا تھکا ہوا جسم پھیلا دیتا۔باپ آدھی رات کو شراب کے نشے میں دُھت، کبھی کبھی سڑی گلی مچھلیاں بازار سے لے کر آتا، انہیں تلنے کے لیے کہتا۔پھُلوا بے دلی سے جیسے تیسے تل کر اسے دیتی۔وہ کھاتا اور ڈھیر ہو جاتا کبھی دیر رات تک گانا گاتا رہتا، کبھی شور شرابہ کرتا—'

رات رفتہ رفتہ خاموشیوں کی گود میں آنکھیں بند کر لیتی۔منوا کی زندگی میں دکھ، دریا کی طرح رواں دواں تھا اور وہ ڈوبتی کشتی کی مانند ہچکولے لیتا رہتا تھا۔پھر بھی وہ رات بھر خوبصورت اُڑن طشتری میں بیٹھ کر خوابوں کی دنیا میں سیر کو نکل جاتا... سنہرے خواب اس کے اردگرد

منڈلاتے رہتے... وہ خوابوں میں کبھی ہنستا، کبھی مسکراتا اور کبھی کبھی رو بھی پڑتا—'

منوا کے شب و روز میں کوئی ایسا لمحہ نہیں تھا جسے کوئی خوبصورت نام دیا جا سکتا۔ اس کا روزانہ کا معمول تھا کہ صبح سویرے اٹھتا، منہ ہاتھ دھو کر یا بغیر منہ دھوئے اپنا بوسیدہ بورا لے کر سامان بیننے کے لیے نکل جاتا۔ راستے میں اُسے کبھی کبھی کوئی ہینڈ بل، پرانا اخبار یا اس کا ٹکرا ملتا وہ اسے اٹھا کر کسی جگہ بیٹھ جاتا۔ اُس میں چھپی تصویروں کو غور سے دیکھتا اور اس میں چھپے حروف کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرتا— کبھی کبھی وہ سفید کاغذ اٹھا کر اس پر ایک دائرہ بناتا۔ دائرے کے درمیان کچھ لکھتا مگر تحریر پڑھی نہیں جا سکتی تھی۔ شاید اس کی انگلیوں کی حرکت کوئی نشان بناتی— پھر اس کاغذ کو موڑ کر اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ ٹوٹے قلم کو جیب میں کھونستا اور اپنے کام میں لگ جاتا—'

جب تک وہ کچرے کے ڈھیر پر رہتا اور سامان بینتا، اُس کچرے کے ڈھیر سے اٹھنے والا تعفن اس کے نتھنوں سے ہوتا ہوا اس کے احساس میں پیوست ہوتا رہتا۔ وہ بدبو اس کے دماغ میں بالکل بس گئی تھی۔ وہ بدبو کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ ایک کچرے کے ڈھیر سے ہٹ کر دوسرے کچرے کے ڈھیر تک پہنچنے کے درمیان جو لمحے آتے وہ لمحے اس کے لیے بے کیف اور سیٹھے ہوتے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ دیر تک وہ کچرے کے پاس ہی رہے تاکہ تعفن کا وجود اس کی تنہائی کا ساتھی بنا رہے اور وہ زیادہ سے زیادہ سامان بھی بین سکے—'

منوا اب سامان کی تلاش میں شہر کے ایک نو آباد علاقے میں بھی جانے لگا تھا۔ اُدھر ابھی دوسرے لڑکے اپنے تھیلوں کے ساتھ نہیں پہنچے تھے۔ یہ علاقہ عام شہری حدود سے ذرا الگ تھلگ تھا اور اس کالونی سے بس تھوڑی ہی دور پر کچرے کا ایک بڑا سا ٹیلہ کھڑا ہو گیا تھا جس مقام پر کچرا ڈالا جاتا تھا اس کے پاس ہی ایک بڑا سا نالا بھی بہتا تھا۔ نالے کی دوسری طرف پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ایک مکان تھا۔ یہ نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ اس میں سمیر ملکانی اور مسز ملکانی رہتے تھے۔ سمیر ملکانی کسی کمپنی میں بڑے عہدے پر فائز تھے، کمپنی نے ایک کار بھی دے رکھی تھی۔ مسز ملکانی کی کوئی خاص مشغولیت نہیں تھی۔ اس لیے ان کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرتا۔ آس پاس کے دوسرے مکان ابھی زیر تعمیر تھے، اس لیے پاس پڑوس میں ملنے جلنے والے بھی نہیں تھے—'

مسز ملکانی روز منوا کو سامان بینتے دیکھتی۔ اُسے بہت افسوس ہوتا کہ غربت نے اس بچے کو کہاں لا کر پھینکا ہے۔ اس کی عمر ابھی پڑھنے لکھنے کی تھی لیکن قسمت نے ہاتھوں میں بورا پکڑا دیا ہے۔ منوا پر مسز ملکانی کو بہت ترس آتا۔ ملکانی کی شادی کو کئی سال ہو گئے تھے مگر ابھی تک اس کی گود خالی تھی شاید اس لیے بھی اس کی نگاہیں منوا کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتیں۔

منوا کو ذرا بھی احساس نہیں ہو سکا تھا کہ کسی کی نظریں اس کا طواف کرتی رہتی ہیں۔ ایک دن اچانک اس کی نظر اس گھر کی طرف اٹھ گئی تو اس نے محسوس کیا کہ ایک عورت مسلسل اُسے ہی گھورے جا رہی ہے۔ پھر اس عورت نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلایا۔ پہلے تو منوا ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید کسی اور کو بلا رہی ہے لیکن جب مسز ملکانی نے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف چل پڑا۔ سامان سے بھرا بورا باہر ہی چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ مسز ملکانی پہلے ہی دروازہ کھول کر کھڑی تھیں۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''منوا۔''

''کہاں رہتے ہو؟''

''پشتہ پر — جمنا کے پاس جو ہے۔''

''کھانا کھایا ہے؟''

منوا نے ''نا'' میں سر ہلایا۔

''یہیں ٹھہرو، ابھی لے کر آتی ہوں۔''

مسز ملکانی اندر گئیں اور ایک اخبار میں چند روٹیاں اور سبزی لے کر آ گئیں۔ منوا کھانا لے کر دور ہٹ گیا۔ مسز ملکانی اُسے دیکھتی رہیں۔ منوا نے بھی مڑ کر ایک بار مسز ملکانی کو غور سے دیکھا۔ پھر ایک جگہ بیٹھ کر روٹی کھانے لگا —'

یہ کوئی نیا واقعہ نہیں تھا۔ وقتاً فوقتاً رحم دل عورتیں اس کی غریبی پر ترس کھا کر اُسے کھانا کھلا دیتی تھیں لیکن یہاں یہ معمول میں داخل ہوتا چلا گیا۔ مسز ملکانی روزانہ اُسے بلا کر کھانا دینے لگیں۔ کبھی کبھی وہ منوا کے پہنچنے سے پہلے ہی کھڑکی کھولے کھڑی رہتیں اور جب منوا آتا تو اُسے کھانا دے کر جیسے انہیں اطمینان ہو جاتا —'

رفتہ رفتہ اس معمول میں ایک تبدیلی یہ بھی آئی کہ اب اخبار میں کھانا دینے کے بجائے پلیٹ میں دینے لگی تھیں اور اُسے وہیں اپنی آنکھوں کے سامنے کھانے کو کہتیں۔ پھر پانی کی ایک بوتل بھی لا کر دیتیں۔ اب کھانا بھی بہتر اور تازہ ہوتا جو گھر میں پکتا وہ منوا کو بھی مل جاتا یا یہ کہیے کہ منوا کے حصے کا بھی کھانا پکنے لگا تھا۔

منوا کی زندگی میں ایک جگنو چمکا تھا۔ سالہا سال سے اس کی زندگی جو ایک ڈگر پر رینگ رہی تھی۔ اُس میں تھوڑی تر و تازگی آ گئی تھی — چند حسین لمحے اس میں شامل ہو گئے تھے... اندھیروں کی یورش سے نبرد آزما رہنے والا منوا اب خود کو اجالے کا ایک حصہ تصور کرنے لگا تھا مگر... مگر وہ اس روشنی کو خود کو کھپا نہیں پا رہا تھا کہ وہ جس زندگی کا عادی تھا وہ اُسی میں جینا چاہتا تھا۔ نرم و نازک اور لطیف جذبوں کو اُس نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ اس نے باپ کی جھڑکیاں سنی تھیں۔ اس کی لات کھائی تھی۔ ماں کی گالیاں بھی اُسے برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ محبت کے گیت سے اس کے کان بالکل نا آشنا تھے۔ اتنی معصوم بھولی بھالی صورت اس نے اپنی ماں کی بھی کبھی نہیں دیکھی تھی —'

منوا اکثر سوچتا — اس عورت سے کیا رشتہ ہے میرا —'

یہ عورت مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہے؟ — اس دنیا میں مجھ جیسے چہرے تو بہت سے ہوں گے لیکن مجھ جیسوں کے لیے تو سب بیگانے ہیں۔ سب انجانے ہیں۔ چہروں کے اس جھرمٹ میں اس عورت کا چہرہ منوا کے ذہن کے آئینہ خانے میں رفتہ رفتہ اپنا عکس بناتا جا رہا تھا — خوابوں کے سانچوں میں ڈھل کر کئی رنگ کئی روپ بدل کر اسے گھیرے میں لیے جا رہا تھا — وہ حیران تھا...'

کیا نام ہے اس رشتے کا — بس بے نام سا ایک رشتہ — وہ بے نام سا رشتہ اور اس عورت کا چہرہ یاد آتے ہی اس کے اندر تازگی آ جاتی — اور منوا سرشاری کے عالم میں اس عورت کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے سحر میں کھو جاتا — وہ عورت کتنی شفیق ہے — اُسے روز کھانا

کھلاتی ہے— شفقت سے پیش آتی ہے— اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہے— جب تک وہ کھانا ختم نہیں کرلیتا اُسے نہارتی رہتی ہے اور جب کھانے سے فارغ ہوجاتا ہے تو پھر اطمینان کی سانس لیتی ہے—'

''اور کچھ چاہیے؟''— مسز ملکانی محبت بھری نظروں سے سوال کرتیں۔ منوا نفی میں سر ہلا دیتا۔ پھر بھی مسز ملکانی اس کی ہتھیلی پر دس کا ایک نوٹ رکھ دیتیں—

''راستے میں تمہیں جو چیز پسند آئے خرید کر کھا لینا''—

منوا کبھی ہتھیلی میں پڑے نوٹ کو دیکھتا اور کبھی مسز ملکانی کو— پھر وہ اٹھتا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر کی جانب بڑھتا۔ جب تک وہ مسز ملکانی کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوجاتا۔ وہ اسے دیکھتی رہتیں۔

زندگی صبح سے شام تک دوڑاتی ہے... پھر رات آتی ہے... اور راتوں کو خوابوں کے سمندر میں غوطہ کھلاتی ہے— منوا کو ایسا لگتا جیسے وہ طوفان کی زد میں ہے اور اس کا وجود اس طوفان کے حصار میں پھنس گیا ہے۔ وہ ہاتھ پیر مار کر طوفان سے بچنا چاہتا ہے لیکن لاحاصل۔ اب اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہے— اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی ہے—

اب وہ سنہرے خوابوں کی جگہ مسز ملکانی کو دیکھنے لگا تھا۔ جو دھیرے دھیرے ممتا کے حصار میں اُسے قید کرتی جارہی تھیں اور وہ ان کی محبت کے سحر میں ڈوبتا جارہا تھا۔ وہ سوچتا— مسز ملکانی کے ساتھ گزارے ہوئے پل بس خواب ہی تو ہیں... فقط چند دنوں کا تماشہ جسے ایک دن ختم ہوجانا ہے—'

وہ محسوس کرتا کہ مسز ملکانی کو دیکھ کر وہ کمزور پڑ جاتا ہے، اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے... کیا اسے لذیذ کھانا کھینچ کر لے جاتا ہے یا دس روپیہ یا پھر کوئی اور شے— حالانکہ اُسے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگتا۔ وہ ہر روز یہ سوچ کر گھر سے نکلتا کہ آج مسز ملکانی سے وہ انکار کردے گا لیکن اس پر نظر پڑتے ہی وہ سب کچھ بھول جاتا۔ وقت کی بوند میں جذب ہوتی آواز اس کے پیروں کی زنجیر بن جاتی۔ پھر اس وقت اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا جیسے وہ کوئی جادوگرنی ہو جس نے اپنے جادو سے منوا کو اپنے بس میں کرلیا ہو اور وہ اس کی طرف کھنچا چلا جارہا ہو...

منوا کے معمول میں جو تبدیلی آئی تھی اُسے ذرا بھی نہ سہاتا... وہ اپنی اصل حالت میں ہی جینا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیا تھا کہ وہ بے بس ہوکر مسز ملکانی کے ایک اشارے پر اس کے پاس پہنچ جاتا— لیکن یہ قربت چند ساعتوں کی ہوتی۔ منوا کے جانے کے بعد مسز ملکانی کو پھر سے تنہائی کا ناگ ڈسنے لگتا۔ ہر طرف ایک سکوت طاری ہوجاتا۔ خاموشیاں سسکیاں بھرنے لگتیں اور ایسے گزرتے لمحوں کی بے اماں وسعتوں میں وہ اپنے وجود کو بے یارومددگار محسوس کرتی... وقت تو بہتا ہوا دھارا ہے... بہتا جائے گا... وقت یوں ہی لمحہ، سال وصدی میں تبدیل ہورہا ہے لیکن وقت کے بہتے ہوئے تیز دھارے میں کہیں وہ گم ہوگئی تو؟... اور تب منوا اس کے حواس پر پوری طرح چھا جاتا۔ کاش منوا میرے ساتھ رہ جاتا تو اسے خوب پیار کرتی... اُسے اچھے اچھے کپڑے پہناتی اور کسی اچھے اسکول میں داخلہ کروادیتی...

آخر ایک دن مسز ملکانی نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ اس دن اس نے منوا کو گھر کے اندر بلایا۔ اُسے غسل خانہ میں لے گئی اور شاور کھول کر نہانے

کے لیے کہہ کر باہر چلی آئی۔ منوا اچھی طرح نہا کر جب باہر نکلا تو اس کا رنگ نکھر آیا تھا۔ مسز ملکانی اسے اپنے بیڈروم میں لے گئی اور نیا سلا ہوا کپڑا اُسے پہننے کو دیا۔ منوا کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ یہ عورت کیا کر رہی ہے— کپڑے پہنانے کے بعد اس کے بال سنوارتی ہے اور ڈھیر سارا پرفیوم اس کے کپڑے پر چھڑک دیتی ہے۔ چاروں طرف تیز خوشبو چکرانے لگتی ہے۔ منوا کو اس خوشبو میں عجیب سی گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں کا وہ قطعی عادی نہیں تھا۔ وہ اس ماحول اور ان سب چیزوں کی لذت سے بالکل نا آشنا تھا۔ اس کی ناک میں تو کچڑے کی سڑانڈ بسی ہوئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک حبس کا عالم طاری ہونے لگتا ہے، ایک ہیجانی کیفیت سے وہ دوچار ہونے لگتا ہے۔ خود کو معمول پر لانے کے لیے اسی سڑانڈ کی طرف بھاگنا چاہتا تھا لیکن مسز ملکانی اس کا راستہ روک کر اسے ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا دیتی ہیں۔ آج ملکانی نے اس کے لیے بہت ہی لذیذ کھانے خاص طور پر تیار کئے تھے۔ منوا ایک نظر پکوان پر ڈالتا تو ایک نظر مسز ملکانی پر اور کبھی خود کو دیکھنے لگتا۔ قاب اور پیالوں سے، خود اس کے کپڑوں سے، ملکانی کے لباس سے یہاں تک کہ آس پاس کی فضا سے بس خوشبو ہی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی جس نے منوا کو پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔ اس کے پیٹ میں سانس نہیں سما رہی تھی اور بالآخر مسز ملکانی نے جیسے ہی اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلانا چاہا۔ وہ چکرا کر کرسی سے نیچے گر گیا اور بے ہوش ہو گیا—!

●●

جائے امان

میں......

میں ہوں کہ مسلسل بھاگ رہا ہوں اور کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے ———،

کہیں یہ میرا واہم تو نہیں کیونکہ جب میں اپنے شہر کے تنگ دائرے سے اکیلا نکلا تھا تو میرے ساتھ کوئی نہ تھا۔ میں تنہا تھا، میرے ساتھ میرا ذہن تھا اور میری آنکھیں تھیں۔ میں آنکھوں سے شہر کے مناظر دیکھنا چاہتا تھا اور ذہن میں محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ دوسرے شہر کی سرحد پار کرنا چاہتا تھا مگر ہوا ایسا کہ جب دوسرے شہر کی سرحد پر پہنچا ہی تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی میرے پیچھے ہے اور میں بغیر اُسے دیکھے سرپٹ دوڑنے لگا۔ جب دوڑتے دوڑتے تھک گیا تو سانسوں کو درست کرنے کے لیے کچھ لمحہ کو رُکا، تب تک وہ میرے تھوڑے فاصلے پر آ کر ٹھہر گیا———

''بھائی میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟''

''میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اِسی ملک کے ہو یا پڑوس سے آئے ہو؟''

''تمھیں کیا لگتا ہے؟''

''تمہاری شکل پڑوسی ملکوں کے لوگوں سے بہت ملتی جلتی ہے؟''

''اور تمہاری؟''

''میں اُن سے مختلف ہوں۔''

''تم نے کبھی آئینہ دیکھا ہے؟''

''کیوں؟''

''تمہاری شکل مجھ سے ملتی ہے۔''

''لیکن تم میرے بھائی نہیں ہو۔''

''تمہارا دشمن بھی نہیں ہوں۔''

’’لیکن ہم نے دشمن تسلیم کر لیا ہے۔‘‘
’’اس میں تمہارا ہی نقصان ہے۔‘‘
’’مستقبل میں فائدہ بھی ہوگا۔‘‘
’’تم یہاں بیٹھ کر فائدہ نقصان کا حساب لگاؤ، میں آگے چلا......‘‘
اور میں آگے بڑھ گیا۔
لیکن ابھی اس شہر کا بغور جائزہ لے پاتا کہ وہاں ایک قبرستان دیکھا۔ ہر طرف قبر ہی قبر، قبروں کے سرہانے لگی تختیاں، جس پر مرنے والے کا نام درج تھا۔ قبرستان کا دروازہ ایک جھناکے کے ساتھ کھلا، کئی لوگ قبرستان میں داخل ہوئے اور قبروں کو کھودنا شروع کر دیا ——— شاید وہ مرنے والے کی شناخت کرنا چاہتے تھے کہ مرنے والا کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ کئی قبروں کو کھودا گیا، کئی پختہ قبروں کو مسمار کر دیا گیا پھر فتح کا نعرہ بلند کرتے ہوئے وہ قبرستان سے باہر نکل گئے۔ میں نے جب آس پاس دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ مسمار قبریں تھیں، ٹوٹی تختیاں تھیں اور میں تھا۔ میں...... میں یہاں کیوں کھڑا ہوں؟ اگر کسی نے دیکھ لیا تو مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرائے گا اور میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاؤں گا۔ میں ایک بار پھر بھاگتا ہوا شہر سے باہر نکل جاتا ہوں ———،
میں اور شہر ———،
شہر اور میں ———،
کبھی شہر مجھ پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔
کبھی میں شہر کو زیر کرنا چاہتا ہوں۔
میں شہر کو صدیوں سے جھیل رہا ہوں۔
اور کبھی شہر مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔
لیکن میں شہر کو کسی طور چھوڑنا نہیں چاہتا۔
میں شہر میں اپنا وجود ضم کر دینا چاہتا ہوں۔
میرا وجود ———!
ہاں! میں کون ہوں؟
میری کیا شناخت ہے؟
میں دیکھتا ہوں ———
ایک چرچ بارود کی ڈھیر پر پڑا سسک رہا ہے،
ایک مسجد سے بم کی آواز کی بازگشت ہو رہی ہے۔

لوگ اپنے اپنے گھروں سے دوڑ پڑے ہیں۔

مسجد سے اُٹھنے والی بارود کی بُو فضا کو آلودہ کر رہی ہے۔

چرچ کے ملبے پر پادری کی لاش خون میں لت پت ہے——،

وہاں موجود سبھی لوگ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے ہیں۔ سبھی کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئی ہیں۔

''یہ اچھا نہیں ہو رہا ہے'' —— متفکر آواز۔

''یہ ہماری شناخت پر حملہ ہے'' —— زوردار آواز۔

''کیا ہماری عبادت گاہیں اب محفوظ ہیں؟'' —— سوالیہ چہرہ۔

''ہم خود کہاں محفوظ ہیں؟'' —— سنجیدہ سوال۔

''چلو ٹوٹی ہوئی مسجد کی تعمیر کی جائے۔'' —— ضعیف آواز۔

اور لوگ چل پڑتے ہیں۔

ٹوٹی ہوئی مسجد کے مینار اور محرابیں ٹھیک کئے جا رہے ہیں۔

''ٹھہرو!'' —— گرج دار آواز۔

''کیا ہے بھائی؟''

''کس کی اجازت سے آپ لوگ مسجد تعمیر کر رہے ہیں؟''

''مسجد ہماری ہے۔ کسی شر پسند نے اسے بم سے نقصان پہنچایا تھا، اب دوبارہ اس کی تعمیر کر رہے ہیں۔''

''آپ کو معلوم نہیں کہ ضلع انتظامیہ کی اجازت کے بغیر آپ ایک اینٹ بھی اس میں نہیں جوڑ سکتے۔''

''کیوں؟''

''یہ نیا قانون ہے۔''

''یہ کیسا قانون ہے کہ ہم اپنی عبادت گاہ کی تعمیر بھی نہیں کر سکتے اور اس کے لئے اجازت کی ضرورت پڑے۔''

''یہ میں نہیں جانتا۔ آپ لوگ کام روک دیجئے ورنہ مجبوراً مجھے آپ لوگوں کو گرفتار کرنا پڑے گا۔''

کام روک دیا جاتا ہے۔

لوگ آپس میں سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ سب کے چہرے پر سوچ کی لکیریں اُبھر آئی ہیں۔

''بھائی یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' —— فکرمند لہجہ۔

''یہ تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''آخر ساری مصیبتیں ہم پر ہی کیوں نازل ہوتی ہیں؟''

''کیوں کہ ہم کمزور ہیں اور متحد نہیں ہیں۔''

''اب کیا کریں؟''

''چلو گھر چلتے ہیں۔''

میں شہر کے سارے مناظر کو اپنی آنکھوں کے ذریعہ ذہن میں محفوظ کرتا ہوں اور شہر سے باہر نکل جاتا ہوں۔

شہر——!

جو جائے امان ہے۔

شہر جو میری پہچان ہے۔

شہر جس سے ماضی، حال اور مستقبل منسلک ہے۔

وہ کھوتا جارہا ہے۔

اب شہر سے بیگانگی کی بوٗ آنے لگی ہے۔

ہم اپنا کسے کہیں؟

ہر شہر ہماری گرفت سے نکلتا جارہا ہے۔

جبکہ شہر کو مٹھی میں بند رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

جب مٹھی کھولتا ہوں تو خال خال نظر آتا ہے، ہاتھوں کی لکیریں پیشانی پر اُبھر آئی ہیں۔ چہرہ، معصوم چہرہ اب کرخت ہوتا جارہا ہے۔ چہرے کے نقوش بدل گئے ہیں۔ کوئی پوچھتا ہے——

''کون ہو بھائی؟''

''حمید ہوں!''

''کون حمید؟''

''حمید کو نہیں جانتے۔''

''وہ شخص کچھ سوچنے لگتا ہے۔ ذہن پر بہت زور دیتا ہے۔

''اب بھی یاد نہیں آیا؟''

''نہیں بھائی، تم ہی بتا دو۔''

''چھوڑو جب تمہیں یاد نہیں تو میں کیوں بتاؤں۔ اگر بتا بھی دیا تو چند لمحوں کے بعد پھر بھول جاؤ گے۔''

''اچھا یہ بتاؤ تمہارا کوئی گھر ہے؟''

''ہے نا، جس میں میں زمانۂ قدیم سے رہ رہا ہوں۔''

''نہیں وہ تمہارا گھر نہیں ہے۔تم نے زبردستی قبضہ کرلیا ہے۔''

''قبضہ، کیسا قبضہ، میرے آباءواجداد تو اسی میں رہتے چلے آرہے ہیں۔''

''نہیں! تمہارے آباءواجداد پڑوس میں ہجرت کرگئے ہیں۔''

''انسانیت سرحدوں میں نہیں بٹتی جناب!''

''لیکن سرحد ہی تو انسان کی پہچان ہے۔گورے کالے، بائیں دائیں، امیر غریب، چھوٹے بڑے ——— سب کو سرحدوں نے اپنے اندر قید کر رکھا ہے۔''

میں نے خود کو دیکھا ——— کیا میں مقید ہوں ——— پھر غور وفکر کیا اور جواب کی تلاش میں بہت دور نکل گیا ——— کس چیز میں قید ہوں؟ ——— میں اپنے اندر کچھ تلاشتا ہوں ———

کچھ نہ کچھ کمی تو ضرور ہے، جس کا فائدہ دوسرے لوگ اُٹھا رہے ہیں۔

''کیا میں بزدل ہوں؟''

''کیا میں بنیاد پرست ہوں؟''

''کیا میں مذہبی ہوں؟''

''کیا میں ایک خول میں بند ہوکر رہ گیا ہوں؟''

''کیا میرے بازوؤں میں تلواریں اُٹھانے کی سکت نہیں؟''

''یا تلواریں ہی زنگ آلود ہوگئیں ہیں؟''

''یا پھر ایمان کمزور ہوگیا ہے؟''

اذان کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔

''اللہ اکبر، اللہ اکبر......''

——— جب اذان کی آواز سنو تو اپنے سارے کام چھوڑ کر مسجد کی طرف دوڑ پڑو ——— میں مسجد کو دیکھتا ہوں۔چند فاصلوں پر ہی مسجد ہے جس میں اِکّا دکّا لوگ وقفہ وقفہ کے بعد جا رہے ہیں ——— مسجد کے بغل والے مکان میں ٹی وی کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے ———

''دل میرا، ہر بار یہ سننے کو بے قرار ہے۔

کہونا پیار ہے......کہونا پیار ہے......''

شاید فلم چل رہی تھی۔

''یار کیا فلم بنائی ہے راکیش روشن نے۔اپنے بیٹے کو سُپر ہٹ ہیرو بنا دیا۔''

''سالہ دس سالوں سے خان لوگ چھایا ہوا تھا، اب سب کی چھٹی ہو جائے گی۔''

''اُدھر ابھیشیک بچن بھی آ گیا ہے۔''

''ہاں اس کا بھی جادو ضرور چلے گا۔''

میں سب سن رہا ہوں، لیکن کچھ بول نہیں پاتا۔ میں گھر سے نکلتے وقت یہ تہیہ کر کے نکلا تھا کہ صرف دیکھوں گا یا سنوں گا، بولوں گا نہیں اور ابھی تک اس پر قائم ہوں۔

پھر میں سوچتا ہوں——

کیا میں کبھی بولا تھا؟

کب بولا تھا؟

۵۴ سال سے تو کچھ نہیں بول رہا ہوں۔

زبانیں گنگ ہو گئی ہیں۔

یا زبانوں پر تالا لگالیا ہے؟

میں اپنی زبان کو ہلا کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ یہ تو ویسی ہی ہے جیسی ۵۴ سال پہلے تھی بلکہ اس سے بھی پہلے—— پھر کیا الفاظ ہم سے چھن گئے ہیں؟—— نہیں الفاظ تو ہماری گرفت میں ہی ہیں۔ میرے ذہن میں محفوظ، البتہ ہم اس کا استعمال بھول گئے ہیں۔

''انقلاب زندہ باد''

''چپ رہو، اب یہ تمہارے الفاظ نہیں ہیں۔ ہمارے ہو چکے ہیں۔''

میں سامنے والے کا چہرہ تکنے لگتا ہوں۔

''اے ایسے کیا دیکھ رہا ہے، آنکھ نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا سالے۔''

میں سٹپٹا گیا اور وہاں سے کھسک گیا۔

ابھی سڑک پار کر کے دوسری جانب مڑا ہی تھا کہ ایک پولس والے نے روک لیا۔

''اے سنو! کہاں سے آ رہے ہو؟''

''جامع مسجد سے۔''

''جانا کہاں ہے؟''

''جامعہ نگر۔''

''جامعہ نگر کو سالوں نے ...... بنالیا ہے۔ نام بتا؟''

''شکیل!''

''پورا نام؟''

''شکیل احمد''

''کہاں کا رہنے والا ہے؟''

''بہار کا۔''

''یا کشمیر کا؟''

''ہم کو تو کشمیری لگتا ہے'' ——— دوسرے سپاہی نے مجھے گھورا۔

''نہیں سر، میں بہار کا ہوں۔ میرے ماں باپ گیا میں رہتے ہیں'' ——— میں خوف زدہ ہو گیا۔

''اور تو یہاں آئی. ایس. آئی. کا ایجنٹ بنا ہوا ہے۔''

''کیا کہا؟ میں اور آئی. ایس. آئی؟''

''نہیں تو بڑا دیش بھگت ہے سالہ۔ بتا اس بار کہاں بم بسپوٹ کرنے والا ہے۔''

''دیکھئے آپ لوگ خواہ مخواہ مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ میں ایک اخبار میں نوکری کرتا ہوں۔ اگر یقین نہیں ہے تو فون کر کے پوچھ لیجئے''۔
اخبار کا نام سن کر دونوں پولس والے تھوڑا ٹھٹھک گئے، مگر فوراً ایک پولس والا بولا۔

''کارڈ دِکھا۔''

میں نے جیب سے کارڈ نکال کر بڑھا دیا۔

''جانے دے یار، اخبار والا ہے۔ رپورٹ کر دے گا تو خواہ مخواہ جواب دینا پڑ جائے گا'' ——— دوسرے پولس والے نے سمجھایا۔ میں فوراً وہاں سے چل پڑا اور سامنے کے بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرنے لگا۔ دونوں پولس والے اب ایک دوسرے شخص سے سوال و جواب میں الجھے ہوئے تھے۔ میری بس آ گئی اور میں اُس پر سوار ہو گیا۔

جب گھر پہنچا تو عافیت محسوس کی۔ بیگ کو میز پر رکھ کر باتھ روم میں گیا۔ فریش ہونے کے بعد کمرہ میں واپس آ کر کرسی پر خود کو گرا لیا۔ آج بہت تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا۔ بہت چلا تھا۔ کوس کوس...... میل میل...... شہر شہر...... سرحد سرحد...... اور ملا تھا آدمیوں سے...... وہ آدمی ہی تھے نا؟...... آدمی میرے اعصاب پر سوار ہے۔ شہر میرے ذہن میں محفوظ اور سرحد آنکھوں میں پیوست ———،

میں احتساب کر رہا ہوں کہ

میں کس شہر کو گیا تھا؟

کس سرحد کے قریب پہنچا تھا؟

اور کن اشخاص سے ملا تھا؟

کہنے کو تو ———،

شہر بھی اپنا ہے——!

سرحد بھی اپنی ہے——!!

اور لوگ بھی اپنے——!!!

پھر میں کہاں گُم ہو گیا تھا؟؟

●●

فصیلِ شب میں جاگتا ہے کوئی

غروب ہوتے ہوئے سورج کی زرنگار شعاعیں جب گاؤں کے خلط ملط مکانوں کی منڈیروں کو چومتے ہوئے مغرب کی سمت جھکنے لگیں اور کچھ ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہوگئیں تو خلاف دستور یکا یک فضا پر ایک دبیز اداس افسردہ سی کیفیت مسلط ہوگئی۔ اس وقت کارو مانجھی گاؤں کی اکلوتی چائے کی دکان سے اُٹھا اور گھر کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ پیپل کے بوڑھے موٹے لمبے لمبے ریشوں والے پیڑ سے لاتعداد چڑیوں کی چہچہاہٹ سناٹے کو مزید بھیانک کر دیا تھا۔ کارو مانجھی چلتے چلتے سوچ رہا تھا ——— ''آج فضا میں اتنی اداسی کیوں ہے اس سے پہلے تو اتنی اداسی نہیں دیکھی''

شام کی سرمئی دھند لکے میں کارو مانجھی اپنے گھر کے بند دروازے کو کھولا۔ گھر میں قدم رکھنے سے پہلے پلٹ کر باہر کی طرف دیکھا۔ باہر اُسی طرح اداسی پھیلی تھی۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پھر ہولے سے دروازہ بند کیا اور صحن میں آ گیا۔ جیب سے ماچس نکال کر جلائی اور لالٹین کو روشن کر دیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی صحن میں اس طرح پھیل گئی جیسی بھوکے آدمی کے پیٹ میں روٹی کے چند نوالے چلے گئے ہوں۔ کارو مانجھی نے لالٹین کے لو ذرا دھیمی کر کے صحن میں ٹانگ دیا اور خود ہی بدبدایا———

''تیس روپئے لیٹر کراسن تیل بلیک میں خریدنا پڑ رہا ہے۔ دو دن میں ایک لیٹر تیل ختم ہو جاتا ہے۔ غریب آدمی کی زندگی کی طرح اسکے گھر میں بھی اندھکار ہی اندھکار گھستا جا رہا ہے۔ سولہ روپئے کیلو سبزی۔ چاول اور گیہوں کا دام بھی آسمان چھو رہا ہے۔ کس کس چیز کے لئے لڑائی لڑی جائے۔ ہر قدم پر ایک لڑائی۔ خاموش رہو تو کیڑے مکوڑے کی طرح مر جاؤ''۔

کارو مانجھی نے چٹائی بچھائی۔ مٹکے سے ایک لوٹا پانی نکالا۔ کڑھائی سے تھوڑی سبزی اور دو تین روٹیاں ایک پلیٹ میں نکال کر کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔ وہ دن بھر میں ایک ہی بار کھانا بناتا تھا اگر دوپہر میں بنالیا تو وہی رات میں بھی کھالیا اور اگر رات میں پکایا تو دوپہر میں کھالیا۔ گھر میں تھا ہی کون۔ تن تنہا کارو مانجھی۔ پتنی تھی جو دو سال قبل ایک موذی مرض میں گرفتار ہوئی اور بالآخر موت کے منہ میں چلی گئی۔ کارو مانجھی کے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا کہ بہتر ڈھنگ سے اسکا علاج کرا پاتا سرکاری اسپتال سے جو دوائیاں مفت میں ملتیں اُسی پر اکتفا کرنا پڑا لیکن وہ دوائیں اسکی پتنی بدھنی کے لئے ناکافی تھیں۔ کارو مانجھی کی جب شادی ہوئی تھی دوسرے سال ہی بدھنی نے ایک مریل

سے بچّہ کو جنم دیا تھا۔ جو ایک ہفتہ کے بعد ہی مر گیا۔ دو سال کے بعد ایک بچّی کو پیدا کیا جو ایک سال کے اندر ہی مر گئی۔ پھر اسکی کوکھ نے کسی گربھ کو سویکار نہ کیا۔

کارو مانجھی اور بدھنی محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے رہے لیکن ایک دن کھیت مالک نے اسکی پندرہ دن کی مزدوری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تب کارو مانجھی کو بہت غصّہ آیا تھا اور اس نے مالک کو ایک زوردار طمانچہ یوں رسید کیا تھا کہ پاس کھڑے لوگوں کے ہاتھ آپ ہی آپ گالوں کو سہلانے لگے تھے۔ لوگ دنگ رہ گئے تھے کہ یہ کیا ہو گیا لوگ انجام سے باخبر تھے اور وہی ہوا۔ اسے پولس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ لیکن پارٹی والوں نے دوڑ دھوپ کر کے اُسے چھڑا لیا تھا۔ اس دن سے وہ پارٹی کا وفادار ممبر بن گیا تھا۔

جاڑے کی سرد رات۔ رات ہوتے ہی سردی بڑھنے لگی تھی۔ کارو مانجھی ابھی بستر پر دراز ہی ہوا تھا کہ اس نے دروازے پر دستک سنی۔ وہ چونک پڑا۔ اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا—— ''کون ہے؟''

''میں ہوں ساتھی''—— کوئی نسوانی آواز کارو مانجھی کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بجلی کی تیزی سے اُٹھا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے کامریڈ V کھڑی تھی۔ وہ فوجی لباس میں تھی۔ ہاتھ میں بندوق۔ کمر میں گولی کی پٹی اور کندھے پر ایک تھیلہ۔ وہ بغیر کچھ کہے اندر آ گئی۔ کارو مانجھی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا——

''کامریڈ آپ اس وقت۔ کہاں سے آ رہی ہیں؟''—— کارو مانجھی کو توقع نہ تھی کہ کامریڈ V اسکے گھر بھی آ سکتی ہے۔ اس نے اسے ایک دو بار پارٹی کی میٹنگ میں دیکھا تھا۔ ایک بار وہ گاؤں میں بھی آئی تھی لیکن اسکے گھر پہلی بار آئی تھی۔

''ساتھی کچھ کھانے کے لئے ہے تو دے دیجئے نہیں تو ایک لوٹا پانی ہی پلا دیجئے''۔—— کامریڈ V نے گھر کا معائنہ کیا۔

''کامریڈ دوپہر کا کھانا ہے میں نے کچھ دیر قبل ہی کھایا ہے۔ چار پانچ روٹیاں اور سبزی بچی ہے۔ اگر آپ کہیں تو لائیں۔''

''بے جھجک لائیے۔ کرانتی کی اس لڑائی میں جو کھانے کو مل جائے غنیمت ہے۔''

کارو مانجھی المونیم کے ایک پلیٹ میں سبزی اور روٹی پروس کر لے آیا۔ ایک لوٹا پانی بھی لا کر رکھ دیا۔ وہ کھانے میں مشغول ہو گئی۔ کارو مانجھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

''ساتھی آپ کھاٹ پر بیٹھئے نیچے کیوں بیٹھ گئے۔''

''نہیں کامریڈ میں یہاں ٹھیک ہوں۔ آپ کھانا کھائیے۔''

''یہ ٹھیک نہیں غلط ہے۔ میں بھی چٹائی پر ہی بیٹھ جاتی ہوں۔''—— کامریڈ V کھاٹ سے اُٹھ کر چٹائی پر بیٹھ گئی اور کھانا کھانے لگی۔

کھانے سے فارغ ہو کر جب کامریڈ V ہاتھ دھو کر پھر سے چٹائی پر آ کر بیٹھ گئی تو کارو مانجھی نے پلیٹ اور لوٹا کو سمیٹتے ہوئے کہا——

''کامریڈ آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ میں جاگتا ہوں۔''

''نہیں ساتھی مجھے یہاں بس چار گھنٹے رکنا ہے۔''——اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا——

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے کامریڈ آپ جاگتی رہیں اور میں سو جاؤں۔ میں بھی آپ کے ساتھ جاگتا رہوں گا''۔

کچھ دیر خاموشی پھیلی رہی کارو مانجھی کامریڈ V کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے اسکا وہ بھاشن یاد آ گیا جو اس نے پارٹی کی ایک میٹنگ میں دی تھی——

''ساتھیو!

آپ کو پتہ ہے ہمیں کرانتی کے ذریعہ مچی تباہی کے لئے قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے اور یہ الزام لگانے والے کون ہیں۔ برژوا ورگ کے لوگ۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب وہ کسی پر ظلم کرتے ہیں تو ان کا انصاف کہاں چلا جاتا ہے۔ آج جب مزدور، کسان اور غریب اس برژوا ورگ کے خلاف کرانتی کی مشعل روشن کر رہا ہے تو یہ آتنک ہو گیا۔ ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ شوسکوں کو کچلے بغیر کوئی کرانتی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ جب ہم مزدوروں اور محنت کش کسانوں نے کرانتی کا جھنڈا اُٹھالیا ہے تو اس بات کا پختہ ارادہ کرنا ہوگا کہ شوسکوں کے پرتی رودھ کو کچل دینا ہمارا کرتیبہ بن گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سماج وادی کرانتی کا برژوا ورگ کے ذریعہ پرتی رودھ پورے ملک میں ہو رہا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس کرانتی کے بڑھنے کے ساتھ پرتی رودھ بھی بڑھتا جائے گا۔ سروہارا اس پرتی رودھ کو کچل دے گا۔ پرتی رودھ کاری برژوا ورگ کے خلاف اس سنگھرش کے دوران ہمارے کرانتی کاری ساتھیوں کے حوصلے اور بھی بلند ہوں گے اور ہم محنت کشوں، مزدوروں اور کسانوں کی سرکار بنانے کی دشا میں آگے بڑھیں گے۔''

دن چڑھے جب کارو مانجھی کی آنکھ کھلی تو وہ بے حد تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور پاؤں یوں محسوس ہو رہے تھے گویا من من بھر کے ہوگئے ہیں۔ وہ جیسے تیسے منہ ہاتھ دھو کر چائے خانہ میں آ گیا۔ پاؤں سمیٹ کر ایک ٹوٹی ہوئی بینچ کے ایک کنارے پر بیٹھتے ہوئے ایک پیالی چائے کی فرمائش کر دی۔ وہاں گاؤں کے کئی لوگ اور بھی چائے پینے میں مصروف تھے۔ بنسی ماسٹر کا بیٹا راکیش نے اپنی موٹر سائیکل چائے خانہ کے باہر اسٹینڈ کی اور دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے اپنے دوست موہن کو وہاں بیٹھا دیکھ کر ہی بائیک روکی تھی——

''کیا بات ہے راکیش بہت گھبرائے ہوئے ہو''——موہن نے چائے کا گلاس اُٹھاتے ہوئے پوچھا جو اسکی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ راکیش اسکے سامنے والی بینچ پر بیٹھ گیا۔''

''تم کو پتہ ہے۔ رات شہر میں کیا ہوا؟''

''نہیں............ میں تو ادھر کئی دنوں سے شہر گیا بھی نہیں ہوں''——اس نے راکیش کے لئے بھی ایک چائے کا آرڈر دے دیا۔

''کل رات نکسلیوں نے شہر پر ہلّا بول دیا۔ وہ جیل توڑ کر اپنے کئی ساتھیو کو چھڑا کر لے گئے۔''

کارو مانجھی کے ساتھ ساتھ وہاں بیٹھے تمام لوگوں نے تجسس بھری نگاہوں سے راکیش کو دیکھا۔

''بھئی یہ تو انرتھ ہو گیا۔ ہم کو لگتا ہے کل کو ودھان سبھا پر بھی نکسلی قبضہ کر لیں گے'' ـــــــ بنواری چاچا نے تشویش ظاہر کی۔

''اب تو کچھ بھی ہو سکتا ہے چاچا۔ نکسلیوں کے حوصلے اتنے بلند ہیں کہ کچھ بھی کر سکتے ہیں'' ـــــــ راکیش نے بھی چِنتا جتائی۔

''لیکن سرکار ان پر لگام کیوں نہیں کستی۔ پنجاب اور کشمیر سے آتنک واد جب ختم ہو سکتا ہے تو بہار سے کیوں نہیں'' ـــــــ موتی لال بھی بولنے سے نہیں چُکے۔

''یہاں بہت مشکل ہے چاچا۔ کیوں کہ دن میں کھیت مزدوری کرنے والا رات میں فوجی لباس پہن کر نکسلی بن جاتا ہے۔ پولس اسکی پہچان کیسے کرے گی۔ معاف کیجئے گا، ممکن ہے یہاں پر جتنے لوگ بیٹھے ہیں ان میں سے ہی کوئی نکسلی ہو ہم، آپ...... یہ...... وہ...... آپ ہی بتایئے کیا اسکی کوئی پہچان ہے'' ـــــــ موہن نے سب کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔

''یہ بات تو ٹھیک ہے پھر بھی سرکار کو کوئی نہ کوئی اُچِت قدم اُٹھانا چاہئے'' ـــــــ راکیش بنواری چاچا کی طرف دیکھ کر بولا۔

''دیکھئے اب سرکار کون سا قدم اُٹھاتی ہے۔ بنواری چاچا بولے۔

''اب اس راجیہ کا بھگوان ہی مالک ہے۔'' ـــــــ موتی لال اُٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے ساتھ کارو مانجھی بھی کھڑا ہو گیا۔ راکیش مزید جانکاری گاؤں والوں کو دیتا رہا۔

چائے خانہ سے نکل کر کارو مانجھی گھر کی طرف بڑھا تو اسکے ذہن میں شہر کا وہ واقعہ نقش ہو گیا تھا۔ وہ اپنے تصور میں پورا واقعہ لمحہ لمحہ بن رہا تھا۔

وقت بوند بوند کر گزرتا ہے۔ آفتاب کہیں ڈوب گیا ہے۔ دھندلکا پھیل رہا ہے۔ آس پاس کی چیزیں رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ کارو مانجھی کا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کا ذہن بار بار کامریڈ V کی طرف چلا جاتا ہے۔ آج ایسی عورتیں کتنی ہیں جو کرانتی کی مشعل لے کر آگے آگے چلیں۔ کسی مہم کی کمانڈنگ کریں اور غریبوں، کسانوں کے حق کے لئے لڑیں'' ـــــ پارٹی کے تئیں اسکا حوصلہ اور بلند ہو گیا۔

ابھی سورج نمودار بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ کارو مانجھی اُٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے پولس کھڑی تھی۔ کارو مانجھی کو دیکھتے ہی پولس نے بندوق تان دی اور دوسرے پولس والوں نے لپک کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور ہتھکڑی پہنا دی۔

''بھئی مجھے گرفتار کیوں کر رہے ہو۔ میرا قصور کیا ہے''

''تھانے چل سالے سب پتہ چل جائے گا'' ـــــ انسپکٹر نے چلاّ کر کہا۔

گاؤں والے حیران تھے کہ کارو مانجھی کو پولس کیوں لے گئی، لیکن گاؤں میں موجود پارٹی کے ممبروں نے کارو مانجھی کی گرفتاری کی خبر پارٹی کے عہدیداروں تک پہنچا دی تھی۔

تھانے لا کر پولس نے کارو مانجھی کو بے تحاشہ مارنا شروع کیا۔

''بتا شہر میں جو نکسلی حملہ ہوا تھا اس میں کون کون لوگ تھے اسکو کمان کون کرر ہا تھا''

لیکن کارو مانجھی کو خود پتہ نہ تھا کہ شہر پر جو حملہ ہوا تھا اس میں کون کون لوگ تھے۔ وہ بار بار انکار کرتا رہا اور پولس پیٹتی رہی۔

جب پولس مار کر تھک گئی تو انسپکٹر نے کہا——

''کل اسے عدالت میں حاضر کرواور جیل بھیج دو۔''

کارو مانجھی درد کی ٹیس کے باوجود مسکرایا اور بولا——

''کون سا جیل انسپکٹر، پھر کوئی جیل بریک آپریشن ہوگا اور مجھ جیسے بے قصور رہا کرالئے جائیں گے تو آپ کیا کیجئے گا۔''

انسپکٹر نے غصے میں بڑھ کر اسے ایک لات ماری اور باہر نکل گیا۔

●●

ڈوبتا اُبھرتا ساحل

موسم گرما کی سخت دھوپ میں آگ اگلتے راستوں سے کچھ پرے، سگنی داتون بیچتی رہتی۔ منہ اندھیرے وہ بستر سے اٹھ کر ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملتی گھر سے نکل جاتی۔ وہ چند روپیوں کے لیے سورج میں اپنے جسم و جاں کو جلاتی رہتی اور جب اُسے یقین ہو جاتا کہ اب وہاں کوئی اُس کے داتون کو خریدنے والا نہیں ہے تب وہاں سے داتون والے کے پاس پہنچتی۔ اُس کے پیسے ادا کرتی اور باقی بچے ہوئے پیسے لے کر گھر کی طرف چل پڑتی۔

لمبی لمبی تارکول کی سڑکوں پر شور کے کانٹے اُگ رہے ہوتے مگر سگنی کے گھر وہ شور شرابہ اور ہنگامہ کہاں؟—— چار لوگوں پر مشتمل اس کا چھوٹا سا پریوار ہے۔ ماں، بابو جی، وہ اور تین سال کا چھوٹا بھائی۔ ماں بابو جی کوڑے اٹھانے کا کام کرتے تھے۔ صبح ہوتے ہی ٹھیلہ لے کر دونوں نکل پڑتے۔ ماں گھر گھر جا کر کوڑے مانگتی اور بابو جی کوڑے کو ٹھیلہ میں جمع کرتے، جب ٹھیلہ کوڑے سے بھر جاتا۔ اُسے کسی ویرانے میں پھینک آتے——'

حسب معمول سگنی روز داتون بیچتی لیکن بس اسٹاپ پر اس کی عمر کے دوسرے بچے بھی داتون بیچا کرتے تھے۔ اس لیے اس کی آمدنی اتنی نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ اس لیے وہ کبھی اسٹیشن کی طرف بھی نکل جاتی۔ اسٹیشن پر اس کی اچھی آمدنی ضرور ہو جاتی لیکن وہاں اُسے پولس کا خوف دامن گیر رہتا۔ وہ داتون بیچنے کے پیسے مانگتا ورنہ ڈنڈے مار کر بھگا دیتا۔ سگنی چھپ چھپا کر داتون بیچتی رہتی اور جیسے ہی پولس پر نظر پڑتی وہ بھاگ کھڑی ہوتی——'

سگنی دھیرے دھیرے روز اسٹیشن جانے لگی اور گھنٹے دو گھنٹے داتون بیچ کر بھاگ آتی کیونکہ اسٹیشن پر نگرانی کرنے والا سپاہی شاید دیر سے آتا تھا۔ جب تک سگنی دس بیس روپے کے داتون بیچ چکی ہوتی لیکن وہ اس سے بے خبر تھی کہ اسٹیشن کا سپاہی کسی خاص مقام سے بیٹھے بیٹھے اسے دیکھتا رہتا تھا۔ بالآخر ایک دن اس ادھیڑ عمر سپاہی نے اسے آ دبوچا۔ سگنی معافی مانگتی رہی، ہاتھ پیر جوڑتی رہی، چھوٹ کر بھاگ جانا چاہی مگر سپاہی کی گرفت مضبوط تھی۔ اس نے سگنی کی کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ پھر وہ اسے لگ بھگ گھسیٹتا ہوا پلیٹ فارم سے دور ایک بہ نسبت سنسان علاقے میں لے گیا۔ اُدھر ایک بوسیدہ ریل کا ڈبہ پٹری کے کنارے لگا تھا۔ وہ سگنی کو لے کر اس ڈبے میں چلا

گیا۔ سگنی کی آنکھوں میں اندھکار اور خوف کے سائے پھیل گئے۔ سپاہی نے بوسیدہ ڈبے کا بوسیدہ دروازہ بند کر دیا۔ سگنی خوف سے کانپ رہی تھی۔ سپاہی آگے بڑھ کر اس کے جسم کو ٹٹولنے لگا۔ سگنی کسمسائی مگر سپاہی کی ڈانٹ نے اس کی آواز کا گلا دبا دیا—'

''چپ رہ سالی۔ نہیں تو ابھی اندر کر دوں گا۔''

سگنی کی زبان بند تھی مگر اس کی آنکھوں کے آنسو بول رہے تھے۔ اُن آنسوؤں میں اس کا اپنا کرب چیخ رہا تھا۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہی کوئی دس سال۔ سپاہی بھی زیادہ دیر وہاں نہیں ٹک سکا مگر سگنی ایک بت کی طرح دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔

اس روز اس کا پورا دن کرب واضطراب میں گزرا۔ دن کے بعد رات آگئی۔ رات تیزی سے بھاگتی رہی اور وہ دیر تک جاگتی رہی۔ سوچ کے دائرے اُسے اپنے شکنجے میں کسے جا رہے تھے۔ اس کی سوچ کا دائرہ پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نے دماغ پر زور ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے بار بار اس سپاہی کا چہرہ کالے ناگ کی طرح نمودار ہوتا جو بار بار اس کو ڈستا جاتا اور ہر بار وہ تڑپ کر رہ جاتی جیسے کوئی اس کے پورے وجود کو کچلے دے رہا ہے اور وہ اس سے نجات حاصل کرنا چاہ رہی ہے۔

سگنی نے ایک گہری سانس لی اور آسمان کی طرف اپنی نظریں اٹھائیں۔ آسمان بالکل شانت تھا۔ اسے اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی محفوظیت کی ساری چھتیں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس کے وجود کا ہر انگ پسینے کی بوندوں کی طرح سردی بھری فضا میں تھرتھرا رہا تھا۔ سگنی نے سوچا وہ اپنی محفوظیت کو برقرار رکھ سکے گی یا ساری دیواریں منہدم کر کے آزاد ہو جائے گی۔ وہ ماں بابو جی کو ساری باتیں بتا دے یا اپنے اندر ہی دفن کر لے۔ وہ بہت دیر تک کشمکش میں گھری رہتی ہے اور نہ جانے کب نیند کی دیوی آ کر اس کے اوپر اپنی چادر تان دیتی ہے۔

پیٹ کی آگ نے سگنی کو پھر سے داتون بیچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ وہ اٹھی اور داتون والے کے پاس پہنچ گئی۔ داتون والے نے داتون دے دیا۔ وہ اسے لے کر سیدھے اسٹیشن پہنچ گئی اور بے دھڑک داتون بیچنے لگی۔ اس کی نظر اس سپاہی پر پڑی مگر اس کی پروا کئے بغیر وہ داتون بیچتی رہی۔ سپاہی نے بھی اسے دیکھا مگر کچھ نہ بولا صرف مسکرا کر رہ گیا۔

اب وہ بے دھڑک اسٹیشن پر داتون بیچتی جیسے اسے کسی کا خوف نہ ہو۔ سپاہی بھی اسے روز دیکھتا مگر کچھ نہ کہتا۔ البتہ جب اس کے اندر کا ناگ پھن اٹھاتا تو وہ سگنی کو لے کر اسی بوسیدہ ڈبے میں چلا جاتا۔ اب سگنی بھی مزاحمت نہیں کرتی۔ اس نے اسے بھی اپنے مختلف کام کی طرح معمول میں شامل کر لیا تھا۔

وقت کی زنجیروں میں ہر شخص گرفتار ہے۔ کوئی زنجیر توڑ کر نکل جاتا ہے۔ کوئی زندگی بھر اسی میں گرفتار رہتا ہے۔ کوئی زنجیر خود پہن لیتا ہے اور کسی کو وقت پہنا دیتا ہے۔ وقت ہر لمحہ ایک زنجیر جوڑتا رہتا ہے۔ ایک سرا کبھی دوسرے سے نہیں ملتا۔ حالانکہ اس سرے کا پتہ لگاتے لگاتے انسان موت کی زنجیر اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔

کئی دن تک سگنی اسٹیشن داتون بیچنے نہیں آئی تو سپاہی کو تشویش ہوئی کہ آخر سگنی کیوں نہیں آ رہی ہے۔ دن اسی طرح گزرتے گئے۔ آخر ایک ہفتے کے بعد پھر سگنی اسٹیشن پر داتون لے کر نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ بالکل اترا ہوا تھا جیسے وہ خوب روئی ہو۔ غمگین چہرے پر کوئی ایسا دکھ تھا

جسے وہ چاہ کر بھی نہیں چھپا پا رہی تھی۔ سپاہی نے اُسے بغور دیکھا اور سوچنے لگا— ''یہ سگنی کو کیا ہو گیا۔ ہرنی کی طرح چوکڑی بھرنے والی لڑکی آج اتنی بجھی بجھی کیوں ہے... اس کی آواز بھی پھٹی پھٹی ہے۔ وہ ٹھیک سے گاہک کو اپنی طرف متوجہ بھی نہیں کر پا رہی ہے۔''

سپاہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ سگنی نے سپاہی کو نگاہ اٹھا کر دیکھا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا بات ہے سگنی؟— آج تو اتنی اداس کیوں ہے؟''

سگنی خاموش رہی۔

''بتا نا کیا بات ہے؟''

سگنی کی آنکھوں سے جھرنے پھوٹ پڑے۔ وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''ہمرے ماں باؤجی سب مر گیئے۔''

''کیسے؟''

''جھونپڑیا میں آگ لگ گئی تھی... بہت لوگ مر گیئے...''

سپاہی کو یاد آیا۔ اس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ سیلم پور پشتہ کی جھونپڑیوں میں آگ لگ گئی تھی۔ جس میں پچاس لوگ جل کر مر گئے تھے۔

سپاہی کو سچ مچ بہت افسوس ہوا۔ وہ سگنی کو ہمدردی سے دیکھنے لگا جو مسلسل روئے جا رہی تھی۔ جیسے کئی دن کے بعد بادل گھرنے کے بعد بارش ہوئی تھی—'

''رومت سگنی... رومت... یہ سب بھگوان کی لیلا ہے''— سپاہی نے اسے ڈھارس بندھائی۔

''اب ہمرا اس دنیا میں کوئیو نہیں... ہم ایک دم اکیلی رہ گئی''— سگنی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

'دکھ کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ دکھ تو بس دکھ ہے۔ دل سے آنکھوں تک دکھ ہی دکھ۔ دُکھ کی وجہ سے ہی آنکھیں ساون بھادو بن جاتی ہیں۔ دل رونے لگتا ہے مگر دکھ نہیں پگھلتا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ سپاہی ایک دم موم کی طرح پگھل گیا۔ اس کی آنکھوں کا کوئی کنارہ ضرور نم ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ایک بھرپور نگاہ سگنی پر ڈالی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل پڑا۔ سگنی نے نفرت سے سپاہی کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ آج بھی وہ اُس ڈبے میں لے جائے گا۔ غصہ تو بہت آیا مگر اپنی زبان سے کچھ نہ کہا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی لیکن آج سپاہی اس بوسیدہ ڈبے کی طرف جانے کے بجائے اسٹیشن کے باہر آ گیا۔ سگنی کو حیرت ضرور ہوئی لیکن پھر اس نے سمجھا کہ ہو سکتا ہے اب کوئی نئی جگہ لے جائے۔ اسٹیشن کے کچھ ہی فاصلے پر سپاہی کا کوارٹر تھا۔ وہ اپنے کوارٹر کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازے پر اس نے دستک دی۔ اس کی بیوی مایا نے دروازہ کھولا۔ ایک لڑکی کے ساتھ شوہر کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی—

''کون ہے یہ؟... کس کو ساتھ لائے ہو؟''— اُس نے کھرے لہجہ میں سپاہی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دو سوال داغ دیے۔ سپاہی خاموش رہا۔ وہ سگنی کو لے کر گھر میں داخل ہو گیا۔ مایا بھی اس کے پیچھے پیچھے آئی—

''میں پوچھتی ہوں کون ہے یہ؟''— مایا سپاہی کے سامنے دیوار کی طرح کھڑی ہو گئی۔

''یہ ایک یتیم اور غریب بچی ہے... پچھلے ہفتے سلیم پور پشتہ کی جھونپڑیوں میں جو آگ لگی تھی۔ اس میں اس کے ماں باپ جل کر مر گئے۔ اب اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے... اب یہ یہیں رہے گی ہمارے پاس... ہماری بھی کوئی اولاد نہیں ہے... یہ رہے گی تو گھر آباد ہو جائے گا''— سپاہی نے نہ صرف تفصیل ہی بتائی بلکہ اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔ مایا نے سگنی کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ کچھ دیر یونہی دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی۔ دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر قائم سختی دور ہوتی چلی گئی اور اس نے پھر بڑی اپنائیت سے کہا—

''آ بیٹی، میرے پاس آ...''

سگنی سپاہی کی باتیں سن کر حیرت میں پڑ گئی تھی۔ اس نے ایک نظر سپاہی کو دیکھا۔ پھر مایا کو اور مایا کے پاس آ گئی۔ مایا نے اس کے گال تھپتھپائے—

''کتنا پیارا چہرہ ہے۔ کیا نام ہے؟''—

''سگنی!''

''نہیں آج سے تیرا نام سنگیتا رہے گا... میں تجھے بیٹی کی طرح پالوں گی... چل پہلے نہا لے''— وہ سگنی کو لے کر باتھ روم کی طرف بڑھتی ہے۔ پھر رک کر سپاہی سے مخاطب ہوتی ہے— ''سنو جی، جاؤ اس کے لیے ایک دو اچھے کپڑے خرید لاؤ...''

''ابھی لے کر آیا!''— سپاہی کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

سگنی سمجھ نہیں پاتی ہے کہ سپاہی کے اندر اچانک یہ تبدیلی کیسے آ گئی۔ اب تک میرے بدن سے کھیلنے والا مجھے اپنے گھر لے آیا اور ایک طرح سے اس نے اپنی بیٹی تسلیم کر لیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس میں بھی اس کی کوئی مصلحت ہو کہ جب گھر پر رہوں گی تو جب چاہے گا میرا استعمال کرے گا۔ ذہنی طور پر اس نے خود کو اس کے لیے بھی تیار کر لیا تھا کہ جب اس کا مقدر ہی یہی ہے تو پھر اس سے گھبرانا کیسا—'

وقت گزرتا جاتا ہے۔ مایا سگنی کو بالکل اپنی بیٹی کی طرح پرورش کرنے لگتی ہے۔ سپاہی بھی اس پر شفقت لٹانے لگتا ہے لیکن وہ کبھی نظر ملا کر بات نہیں کرتا جیسے وہ اس کا مجرم ہو۔

سگنی اب اور بھی حسین اور جوان نظر آنے لگی تھی۔ مایا نے اُسے پہلے تو خود پڑھایا پھر ٹیوٹر رکھ کر اُسے دسواں پاس کروایا۔ اب سگنی اخبار، میگزین بھی پڑھنے لگی تھی۔ ٹی۔ وی پر سماچار بھی دیکھتی۔ اُسے سمجھتی بھی اور مایا سے اس پر اظہارِ خیال بھی کرتی—'

سگنی کو ایسا محسوس ہوتا گویا کسی نے اُسے جھولے پر بٹھا کر بڑی لمبی پینگ دے دی ہو۔ اس کے چہرے سے خوشی ٹپکی پڑتی تھی مگر دل دھڑکے بھی جا رہا تھا۔ دل کے اندرونی گوشے میں ایک کانٹا سا چبھتا رہتا۔ اس کی آنکھیں خوف زدہ دروازے کو تکتی رہتیں— جب رات اس کے کمرے میں اندھیرے کے ساتھ سمٹ جاتی تو یاد دلاتی اُسے ماضی کے وہ ہر ایک پل جو اس نے سپاہی کے ساتھ بوسیدہ ریل کے ڈبے میں گزارے تھے۔ وہ ان لمحوں کو یاد کر کے اُداس ہو جاتی۔ اس کی سوچ بکھرنے لگتی۔ فقط اُداس لمحے کا نام زندگی تو نہیں— لمحے کبھی روشنی ہیں۔

لمحے کبھی چاندنی ہیں۔
لمحے کبھی راگنی ہیں۔
کبھی کسی پل چمکنے لگتا سورج—— سگنی کی زندگی کا بھی سورج روشن ہو گیا تھا۔ اپنی تابنا کی کے ساتھ۔

سپاہی کے اندر بھی ایک کانٹا تھا جو ہمیشہ اُسے چبھتا رہتا۔ اُس نے سگنی کو زبان سے بیٹی تو بنالیا تھا لیکن اس کی چڑھتی جوانی اور سندرتا کو دیکھ کر کبھی کبھی اس کے اندر کا سانپ پھن اٹھا کر سگنی کو ڈسنے کے لیے اُکساتا مگر اُسے مایا کا ڈر بھی رہتا۔ مایا سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتی۔ جب کچن میں کھانا بناتی اس وقت بھی اپنے ساتھ رکھتی اور اس سے باتیں کرتی رہتی۔ دیر رات تک اسے اپنے پاس بٹھاتی اور اپنے بیتے دنوں کی باتیں اُسے سناتی رہتی۔ سپاہی یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔ اُسے ماں بیٹی کا یہ پیار کھلنے لگا تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ سگنی اس کے کمرے میں بھی آئے، اُس سے باتیں کرے، اس کا دل بہلائے لیکن سگنی شاید سپاہی کے پاس آنے سے بھی ڈرتی تھی، کتراتی تھی۔ اُسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ اگر مایا کو پتہ چل گیا تو شاید اسے ہی خراب لڑکی کہہ کر گھر سے نکال دے کہ اس کے پتی پر اس نے ڈورے ڈالنے شروع کر دیے ہیں۔
اب سگنی الگ کمرے میں سوتی تھی کیونکہ اسے دیر تک پڑھنے کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ مختلف Subject کی کتابوں میں اپنا زیادہ تر وقت گزارتی کہ ماضی کا کوئی بھی پل وہ اب اپنے ذہن کے نہاخانے میں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس سے فرار حاصل کرنا چاہتی تھی اور ماضی کی یادوں سے چھٹکارا پانے کا حل اس نے کتابوں میں تلاش لیا تھا——'
آج کی رات اپنے برہنہ جسم پر سیاہ راکھ مل کر نمودار ہوئی تھی۔ ہوائیں دیوانہ وار رقص کر رہی تھیں۔ سیاہ بادل امڈے چلے آتے تھے۔ رات کے ایک بج رہے تھے۔ سپاہی کی آنکھوں سے آج نیند نے اپنا خیمہ اکھاڑ لیا تھا۔ اس کا ذہن بار بار سگنی پر جا کر مرکوز ہو جاتا۔ اسے کبھی لگتا کہ اس نے گھر میں لا کر سگنی کو غلطی کی ہے۔ اسے اسی حال میں چھوڑ دیتا تو جب چاہتا اس کا استعمال کرتا لیکن گھر میں لا کر اپنے لیے مشکل پیدا کر لی ہے۔ مایا کو پتہ چلے گا تو کیا سوچے گی۔ وہ تو اسے بالکل اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہے۔ جہاں بھی جاتی ہے ساتھ لے کر جاتی ہے۔ ایسی حالت میں کیا وہ سگنی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے کسی گوشے سے آواز آتی——اس میں حرج ہی کیا ہے۔ وہ تمہاری سگی بیٹی تو نہیں ہے۔ گھر میں رکھ لینے سے کوئی بیٹی تو نہیں ہو جاتی پھر سگنی کو بھی تو سب کچھ پتہ ہے۔
مختلف قسم کی کشمکش میں گھرا سپاہی اپنے کمرے سے بالآخر نکلتا ہے اور سگنی کے کمرے کی طرف چل پڑتا ہے۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ سگنی گہری نیند میں سوئی تھی۔ نائٹ بلب میں وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ دوپٹہ ایک طرف سرک گیا تھا اور جوانی کے نشیب و فراز سپاہی کے ضبط کے باندھ توڑے ڈال رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپی شروع ہو جاتی ہے اور چہرے پر پسینے کی بے شمار بوندیں لرزنے لگتی ہیں۔ اس کشمکش کے عالم میں اس کا ہاتھ سگنی کے بدن سے جا ٹکراتا ہے۔ سگنی کی آنکھ اچانک کھل جاتی ہے اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ سپاہی کو اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھبک اٹھتے ہیں۔ وہ

اسے نفرت سے دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ڈوپٹہ دور پھینک دیتی ہے اور شمیض اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہے... سپاہی کے اندر جیسے ایک بجلی سی کوندتی ہے۔وہ لپک کر سگنی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔اس کا دوپٹہ اٹھا کر اسے قاعدے سے اوڑھاتا ہے۔اس کا ایک پلو سر پر ڈالتا ہے اور بلکتے ہوئے اس کی پیشانی پر ایک شفیق بوسہ ثبت کرتا ہے اور سر جھکائے دھیرے دھیرے کمرہ سے نکل جاتا ہے۔

سگنی کے اندر بھڑکتے ہوئے شعلے اچانک سرد ہو جاتے ہیں اور اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج سچ مچ اس کا کھویا ہوا باپ اس کو مل گیا—!

●●

منتظر لمحوں کی آواز

زندگی وقت کے دھاروں سے صدا دیتی ہے ——،

اور شاکر وقت کی شاہ راہ پر نکل پڑا ہے ——،

آدمی وقت کے ساتھ رقص کرتا ہے پھر وقت زندگی کو آگے بڑھاتی ہے —— وقت آگے چلتا ہے یا زندگی آگے چلتی ہے یا دونوں ساتھ ساتھ —— مگر آدمی تو ان دونوں کا ایک حصہّ بن جاتا ہے ——،

شاکر بھی ایک آدمی ہے اور شبستاں اس وقت اس کی زندگی کا ایک حصہّ ہے —— شبستاں اب شاکر کے لئے اجنبی نہیں رہی تھی۔ اسے وہ برسوں سے جانتا تھا۔ اس کے گھر اکثر جاتا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی بھی دلچسپی شاکر میں بڑھتی گئی۔ وہ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد جیسے ہی چلنے کو تیار ہوتا شبستاں روک لیتی ——

’’اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی تو آپ آئے ہیں، کچھ دیر اور بیٹھئے نا! ——‘‘

شاکر بیٹھ جاتا۔ پھر اکثر کھانے پر روک لیتی ——

’’کھانا کھا کر جایئے گا۔‘‘

شبستاں کی امّی اسی اسکول میں ٹیچر تھیں جہاں شاکر پڑھاتا تھا اور یہ تعلقات اسکول سے گھر تک پہنچ گئے تھے —— شبستاں خوبصورت تھی اور رفتہ رفتہ شاکر کا جھکاؤ بھی اس کی طرف ہوتا گیا۔ پھر دونوں قریب آتے گئے۔

زندگی وقت کے دھاروں سے صدا دیتی ہے۔ ——،

پھر شاکر کا ارادہ مستحکم ہو جاتا ہے اور اس کا پیار مزید پروان چڑھنے لگتا ہے ——،

’’شبستاں تم بہت سوچتی ہو؟‘‘ —— شاکر نے اس کی خاموشی توڑی۔

’’مجھے اس زمانے کا بیحد خوف ہے کہیں یہ سماج جینا مشکل نہ کر دے‘‘ —— شبستاں کے چہرے سے خوف نمایاں تھا۔

’’شبستاں جب ارادہ مستحکم ہو تو دنیا کی کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکتی‘‘ —— شاکر نے اسے حوصلہ بخشا۔

’’پھر بھی......‘‘

’’میرے اندر سب سے لڑنے کی ہمّت اور جرأت ہے۔ مجھے صرت تمہارا ساتھ چاہئے‘‘——

’’آپ تو جانتے ہیں میں کس قدر بزدل ہوں۔ ذرا ذرا سی بات پر خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ مجھے ہمیشہ یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں میں کمزور نہ پڑ جاؤں۔‘‘

’’میں ہوں نا تمہارے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے لئے......اب چھوڑ و ان باتوں کو اور جلدی سے میرے لئے کچھ کھانے کا انتظام کرو، بہت بھوک لگی ہے‘‘——شاکر نے گفتگو کو یہیں ختم کرنا چاہی——

’’بس پانچ منٹ انتظار کیجئے۔ میں ابھی آئی‘‘——

اور شبستاں کچن میں داخل ہو گئی۔

زندگی وقت کے دھاروں سے صدا دیتی ہے——؟

شاکر دیکھتا ہے نرم نرم گھاس پر اوس کے حسین قطرے دھوپ کی نئی کرنوں کے باعث جگمگا رہے ہیں۔شبستاں کا چہرہ بھی تو اسی طرح روشن ہے مگر وہ دنیا کے نشیب وفراز سے ناواقف ہے یا جان بوجھ کر نظر انداز کرتی ہے، کہا نہیں جا سکتا لیکن اس کا فائدہ اس کے ساتھ رہنے والے رشتے دار اکثر اُٹھا لیتے۔ان کی امّی شاکر سے کہتیں——

’’آپ شبستاں کو سمجھائیے۔ گھر کا بہت سارا کھانے پینے کا سامان لوگوں میں بانٹ دیتی ہے۔اگر یہی عادت رہی تو جہاں جائے گی اس کی زندگی دوبھر ہو جائے گی۔‘‘

شاکر اسے سمجھاتا تو وہ کہتی——

’’جب میں ’’نا‘‘ کہتی ہوں تو لگتا ہے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہے۔اندر سے دل عجیب طرح کا کچوٹنے لگا تا ہے جب کہ میں جانتی ہوں کہ اس سے میرا ہی نقصان ہونے والا ہے......میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔‘‘

شاکر خاموش رہ جاتا کیونکہ شبستاں نے اپنی دلیل سے شاکر کو قائل کر دیا تھا۔

زندگی وقت کے دھاروں سے صدا دیتی ہے——،

اور شاکر وقت کی شاہراہ پر رواں دواں رہتا ہے—— کافی جدوجہد اور بھاگ دوڑ کے بعد بھی جب وہ اپنے شہر میں نوکری حاصل کرنے میں ناکام رہا تو دوسرے شہر ہجرت کرنے کا ارادہ کیا، اس دن شبستاں صرف خاموش رہی تھی۔اب تک شاکر اتنے طویل عرصے کے لئے اس سے دور نہیں گیا تھا۔لیکن رفتہ رفتہ جدائی کی آگ ٹھنڈی ہوتی گئی۔کچھ مہینوں تک فون اور خط کا سلسلہ جاری رہا لیکن آہستہ آہستہ شبستاں کی طرف سے بے اعتنائی برتی جانے لگی اور پھر خط کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔شاکر اپنے کام میں اس قدر مصروف ہو گیا کہ اس نے اس بارے میں سنجیدگی سے غور بھی نہیں کیا کیونکہ دولت کمانے اور روپیہ جمع کرنے کی دھن میں سب کچھ گویا بھول گیا تھا لیکن جب ایک دن اس نے کلینڈر پر نگاہ ڈالی تو پایا کہ دو سال کا وقفہ گزر چکا ہے۔اس نے جلدی جلدی چھٹی لی اور گھر کی راہ لی کہ کہیں زندگی وقت کے دھاروں

کے ساتھ بہہ نہ جائے اور وہ وقت کے ساحل پہ تنہا کھڑا رہ جائے۔۔۔۔۔
جب شاکر اپنے شہر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بہار کا موسم گزر چکا ہے اور خزاں نے اپنے پر پھیلا دیئے ہیں۔۔۔۔۔ شبستاں کی شادی ہو چکی تھی اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔۔۔۔۔ شاکر اندر سے ٹوٹ گیا۔ ٹوٹتا چلا گیا۔ وہ اکثر سمندر کے کنارے پہروں بیٹھا رہتا۔ شبستاں کی یادوں میں کھویا رہتا۔ شبستاں نے اس کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔

شاکر نے ایک بار سمندر کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔

''اف اوہ!''۔۔۔۔۔ اس کی سوچ کا تیز دریا ابلتا ہے اور ساحل پر کھڑی تمام یادوں کو بہا لے جاتا ہے۔ ماضی کی کشتیاں کنارے پر شکستہ پڑی ہیں۔ وہ سمندر سے کتنی دور آ گیا ہے مگر اس کی یادیں۔۔۔۔۔

یخ زدہ ٹھنڈی ہواؤں میں اس کا جسم ٹھٹھر رہا تھا۔ اس نے کمرہ میں پہنچ کر آگ روشن کر دی۔ کمرہ میں تنہائی پسری ہوئی تھی مگر اس کی تنہائیوں میں ہوا خلل ڈال رہی تھی۔ جب شاکر ہوا کی آواز پر کان ڈالتا ہے۔۔۔،

کچھ سنائی نہیں دیتا ہے۔

وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے۔

کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے۔

صدا سب بے رنگ ہو گئے ہیں۔

شاکر نے سوچا۔۔۔۔۔ کب تک اس کی یادوں کا اسیر رہوں گا۔ ان یادوں سے سدا کے لئے پیچھا چھڑانا ہے کیونکہ یادیں انسان کو کمزور بنا دیتی ہیں اور وہ کوئی مضبوط فیصلہ نہیں کر پاتا ہے جب کہ شاکر ایک توانا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں ایک عکس اتارنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ رات پہروں تلک وہ جاگتا رہا۔ نیند سے بوجھل پپوٹے بند ہونے لگے تھے کیونکہ اس کی آنکھوں نے جو عکس دیکھا تھا وہ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے کھب گیا تھا۔۔۔۔۔ بالآخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا اور مسکراتا ہوا اُٹھا۔۔۔۔۔

شاکر شبستاں کے گھر پہنچ گیا۔ شبستاں اسے دیکھ کر کچھ پل کے لئے خوف زدہ سی ہو گئی لیکن شاکر نے مسکرا کر وش کیا تو شبستاں نے بھی اس کا جواب مسکرا کر دیا۔ شبستاں شاکر کو اپنے شوہر سے ملوایا۔ کافی دیر تک تینوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ شبستاں نے چائے پلائی اور شاکر وہاں سے اس طرح رخصت ہوا جیسے اس کے ساتھ کچھ نہیں ہوا ہو بلکہ ایک دوست کے یہاں سے واپس ہو رہا ہو۔

زندگی وقت کے دھاروں سے صدا دیتی ہے۔۔۔۔۔،

وقت گرزتا گیا، شاکر اپنے کام پر لوٹ گیا۔ رفتہ رفتہ سب کچھ ماضی میں تبدیل ہو گیا اور وقت نے شبستاں کے گھر ایک چاند سی بیٹی کو اس کی گود میں اتار دیا۔ ہو بہو اس کی شکل لے کر نمودار ہوئی تھی۔ شبستاں نے اس کا نام مہہ وش رکھا تھا۔۔۔۔۔

ابھی مہہ وش ایک سال کی ہی ہوئی تھی کہ ایک دن دروازے پر کھیلتے ہوئے کسی نے اس کا اغوا کر لیا۔ یہ خبر شاکر کے گھر والوں نے اسے فون سے بتائی تھی۔ شاکر نے افسوس کا اظہار کیا بلکہ شبستاں کو فون کر کے اسے ڈھارس بندھائی۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ اس کا شوہر بھی بیحد

پریشان تھا۔شبستاں نے بتایا کہ پولس میں رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔تفتیش ہوئی لیکن مہہ وش نہیں ملی۔

زندگی وقت کے دھاروں سے صدا دیتی ہے——،

رات تیزی سے بھاگ رہی تھی اور شبستاں جاگ رہی تھی۔ایک نہیں دو نہیں کئی راتوں کو اس نے اپنی آنکھوں میں کاٹی تھی۔اسے خود پتہ نہ تھا لیکن ہر لمحہ سوچ کے دائرے اسے اپنے گرفت میں لیے ہوئے تھے اور وہ اس سے نکلنے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی۔آنکھیں تھک کر سوئی نہیں کہ صبح ہوگئی اور اس نئی صبح نے پھر سے اس کے آنگن کو روشن کر دیا——دوسرے سال شبستاں کے گھر چاندسی ایک اور بیٹی نے ہولے ہولے قدم رکھا اور شبستاں اس چاند کو پا کر نہال ہوگئی۔وہ اپنے سارے غم بھول گئی، بلکہ گھر کے تمام افراد اس کو ایک حادثہ سمجھ کر بھلا بیٹھے——لیکن شبستاں کو لگتا تاریکی شب میں جیسے کوئی بے آواز قدموں سے چلا آتا ہے ان دیکھی دشاؤں سے،کوئی اس کی اور بڑھتا ہے۔اگر چہ اس کی خوشی کا سورج نمودار ہو چکا تھا مگر فضا دھند کے سمندر میں غوطہ زن تھا——

کئی سال بعد جب شاکر اپنے شہر لوٹا تو شبستاں سے ملنے اس کے گھر گیا۔کیونکہ شادی کے بعد بھی کئی بار اس سے ملنے اس کے گھر جاتا رہا تھا۔اب شبستاں میں وہ دلکشی اور دلفریبی نہیں رہی تھی۔وہ ایک گھریلو عورت بن کر رہ گئی تھی۔اب اس کی بیٹی دس سال کی ہوگئی تھی اور اپنی نانی کے اسکول میں پڑھنے جاتی تھی۔شبستاں نے شاکر سے کہا——

''اب آپ کو سب کچھ بھول جانا چاہئے اور کسی اچھی لڑکی سے شادی کر لینی چاہئے''——شبستاں کی ہمدردی عیاں تھی۔

شاکر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا——

''میں تمہاری طرح شادی میں جلدی نہیں کروں گا۔''

''تو کیا بڑھاپے میں شادی کریں گے۔''

شاکر ہنستا ہے اور اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیتا ہے۔

''شبستاں دراصل میں تم سے ہی شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ چونک پڑی۔اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔دل و دماغ کا ریشہ ریشہ کپکپا اُٹھا۔اس کے دماغ میں شاکر کی باتیں کانٹے کی طرح اٹک گئیں مگر فوراً سنبھل گئی اور تقریباً چیخ پڑی——

''مجھ سے؟——آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے۔میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو بچے ہیں اور اب دونوں بیٹیاں بڑی ہو رہی ہیں''——وہ کچھ لمحہ کے لئے رکتی ہے۔سوچتی ہے اور پھر گویا ہوتی ہے——''کہیں آپ میرے شوہر کا قتل تو......''

شاکر نے قہقہہ لگایا۔وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔دیر تک ہنستا رہا۔پھر اچانک خاموش ہوگیا۔

''تمہارے دل میں دوسوسے کا ہونا لازمی ہے——کیونکہ تم میری مجرم ہو——لیکن میں اتنا کائر نہیں کہ کسی کو رات میں تنہا بستر پر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے کے لئے چھوڑ دوں۔''

شبستاں اپنے ہاتھوں کو اپنے سینے پر لے جا کر اطمینان کی سانس لیتی ہے——''میں تو ڈر گئی تھی۔کبھی کبھی آپ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ

میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔''

تبھی شبستاں کی دونوں بیٹیاں اسکول سے واپس آجاتی ہیں۔وہ شاکر کو سلام کرکے اندر کمرہ میں چلی جاتی ہیں۔شاکر دونوں کو بغور دیکھتا ہے۔

''ماشاءاللہ دونوں اب کافی بڑی ہوگئی ہیں۔''

''ہاں مجھے تو ابھی سے ان کی شادی کی فکر ہونے لگی ہے۔لڑکیوں کو بڑھتے دیر نہیں لگتی۔''

''یعنی تم تین بیٹیوں کی ماں ہوگئی ہو۔''

یہ جملہ سن کر شبستاں افسردہ ہوگئی۔افسردہ لمحوں میں اس کے چہرے پر غمناکی کی لکیریں پھیل گئیں۔کرب وغم سے چور بہت ہی مدھم آواز شبستاں کی ابھری——

''ہاں اگر مہ وش ہوتی تو وہ ان سے بھی بڑی ہوگئی ہوتی لیکن خدا کو منظور نہ تھا۔مجھ سے چھین لیا۔''

''شبستاں مان لو اگر تمہاری مہ وش تمہارے سامنے آکر کھڑی ہوجائے تو تم اسے پہچان لوگی۔''

''شبستاں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔نہایت ہی دھیمی آواز میں وہ بولی——

''ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر ہی پہچان لیتی ہے۔میں اسے ضرور پہچان لوں گی۔اگر کہیں وہ زندہ ہوگی تو بالکل میرے اوپر ہی گئی ہوگی۔وہی رنگ روپ اختیار کیا ہوگا۔وہی ناک نقشہ وہی ادائیں،وہی سب کچھ......

بولتے بولتے اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔

''تم جاگتی آنکھوں سے بھی خواب دیکھ لیتی ہو۔''——شاکر اسے خواب سے حقیقت کے دھراتل پر لے آیا۔

''ہاں اب اُسے یاد کرنے سے کیا حاصل——ایک سال کی بچی ماں سے جدا ہوکر کب تک زندہ رہی ہوگی۔''

شبستاں کی آنکھوں سے بےقراری ظاہر تھی۔شام تو جیسے تیسے گزر گئی مگر رات نے اسے بےچین کردیا۔کافی دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔پوری رات کرب واضطراب میں گزر گئی۔اس کی زبان بند تھی مگر اس کی آنکھوں کے آنسو بول رہے تھے۔ان آنسوؤں میں اس کا درد چیخ رہا تھا۔

زندگی وقت کے دھاروں سے صدا دیتی ہے——

کتنے ہی سال بیت گئے تھے شاکر کو شبستاں سے جدا ہوئے۔وقت کتنا بےرحم ہوگیا تھا۔ہر پل دوسرے پل کا انتظار کر رہا تھا کہ آنے والا پل کون سا شگوفہ کھلائے گا۔شاکر جی رہا تھا مسلسل اور متواتر——اور دیکھ رہا تھا اپنی آنکھوں میں ایک عکس۔ایک ایسا عکس جو صفر سے شروع ہوکر اعداد کی حدود میں داخل ہوگیا تھا۔اب اس کی خوشی کا سورج آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔اس کی نظریں منظر کے ایک ایک خدوخال پر گڑی رہیں۔شاکر نے ایک ہلکی سی سانس لی اور آسمان کی طرف اپنی نظریں اُٹھائیں۔شاید وہ آسمان سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر آسمان بالکل شانت تھا لیکن شاکر بہت خوش تھا——اب اس نے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا۔یکایک اس کی خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔مگر اس نے

محسوس کیا۔اس کے جسم کے اندر کوئی بے چین پرندہ پھڑ پھڑا رہا ہے۔اس کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔لمحوں کی قید میں گھرا وہ خود کو بے چین پرندہ محسوس کرتا ہے۔بس ایک ہی لمحہ کا وہ منتظر تھا اور وہ لمحہ بس جلد ہی آنے والا تھا۔

شاکر کے گھر والے حیران تھے کہ شاکر نے اتنی دیر سے شادی کا فیصلہ کیوں کیا۔جب کہ اس کے لئے بہت اچھے اچھے رشتے آتے رہے لیکن ہر کسی کو انکار کرتا رہا اور یہ اچانک......

شاکر اپنی دلہن کو لے کر اپنے شہر لوٹ آیا۔ہر ایک نے دونوں کا پر جوش استقبال کیا۔شاکر کی بہنیں پھولی نہیں سما رہی تھیں کہ اب اس گھر میں ان کی بھابھی بھی آ گئی تھی۔

شاکر کی شادی کی خبر شبستاں اور اس کے گھر والوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔شبستاں نے فون پر مبارک باد دی تھی اور ایک دن دعوت کا اہتمام بھی کیا تھا کہ اپنی دلہن کے ساتھ کھانے پر آئے۔

شاکر جب اپنی بیوی کو لے کر شبستاں کے گھر کے دروازے پر پہنچا۔اس کی سانسیں لرز رہی تھیں اور آنکھیں کانپ رہی تھیں لیکن دروازہ کھلتے ہی اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔چہرے کا تیج بڑھ گیا۔فخر سے گردن تن گئی۔سامنے شبستاں کھڑی تھی۔اس نے پرتپاک انداز میں شاکر کا خیر مقدم کیا لیکن اس کی دلہن پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹھک گئی۔اس کی ذہنی کیفیت سنجیدہ ہو گئی۔اس نے اس کو بغور دیکھا۔اور دماغ پر زور ڈالنا شروع کیا۔کافی دیر تک اس کی نظریں اس پر مرکوز رہیں اور بمشکل صرف ایک لفظ اس کی زبان سے نکلا——

''مہہ وش!''

●●

پناہ گاہ

نہ جانے کہاں سے لکھمنیا کی ریگستان کی طرح خشک آنکھوں میں پانیوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔اس کا دل بھر آیا۔اُس نے اپنی چھ سالہ بیٹی سمتا کو زور سے بھینچ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔سمتا بھی ماں کو روتا دیکھ کر بلک پڑی۔بیٹی کو بلکتا دیکھ کر لکھمنیا نے اُسے خود سے الگ کیا——

''ہمرا مقدر ہی خراب ہے بیٹی۔ہم بڑی بدنسیب ہیں''——آواز گلے میں پھنسنے لگی——'' ہملوگوں کا ایک ہی سہارا تھا۔وہ بھی چھن گیا۔ہم بے سہارا ہو گئے اور توانا تھ''——لکھمنیا نے آنچل سے آنسو خشک کئے پھر سمتا کے آنسو پوچھنے لگی اس نے آسمان کی طرف دیکھا——دکھوں کا سمندر کتنا گہرا کتنا وسیع ہوتا ہے——'' ہے بھگوان میرا گناہ کیا تھا جو اتنی بڑی سزا دی۔ہم ماں بیٹی کے لئے روٹی پیدا کرنے والے کو ہی اُٹھا لیا''۔

لکھمنیا کا پتی ہزاریکا کو مرے آج تیسرا دن تھا۔لکھمنیا تین دن سے رہ رہ کر رو رہی تھی۔کبھی اُسکے آنسو خشک ہو جاتے تو کبھی جھرنوں کی طرح بہنے لگتے۔نہ اُسے کھانے کی سدھ تھی نہ پینے کی لیکن سمتا کی بھوک کا جب اُسے احساس ہوتا۔گھر میں بچا کچا کھانا اسے کھلا دیتی۔گھر کیا تھا ایک جھونپڑی تھی جس میں بس تین جون کسی طرح پیر پسار کر سو سکتے تھے۔جھونپڑی سے لگی ہی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔جس کا منہہ سڑک کی طرف کھلتا تھا۔دکان کی چھت بھی پھوس ہی کی تھی۔جب ہزاریکا زندہ تھا تو اسی دکان میں چائے اور پکوڑے بیچتا تھا۔دکان اور مکان کے درمیان میں ٹاٹ کا ایک پردہ تھا جو دونوں کو دو حصےّ میں تقسیم کرتا تھا۔لکھمنیا جھونپڑی کے اندر بیٹھ کر پیاز کاٹتی یا بیسن گھولتی۔ہزاریکا پکوڑے تلتا، چائے بناتا اور اکیلئے ہی گاہکوں کو بڑھاتا۔دکان کا سارا کام وہ تقریباً اکیلے ہی کرتا۔چائے بنانا، پکوڑے تلنا، گاہکوں کو پانی بڑھانا یا جوٹھے برتن اُٹھانا۔البتہ لکھمنیا جوٹھے برتن کو دھو کر دکان میں بھجوا دیتی۔ہزاریکا، لکھمنیا کو دکان میں اس لئے آنے سے منع کر دیا تھا کہ پتا نہیں کس گاہک کی نظر کیسی ہو۔کبھی کوئی فقرہ ہی کس دے یا بری نظر سے دیکھ ہی لے۔

دُکان سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ تینوں جون کا گزارہ آرام سے ہو جاتا تھا لیکن اتنا پیسہ نہیں بچتا تھا کہ پیٹ کے جہنم کو بجھانے یا تن کو ڈھانپنے کے علاوہ کچھ اور سوچ سکے۔تین روپیہ تو اُسے روز سرکاری سوچالیہ میں دینے پڑتے تھے۔اسکی دکان شہر کے بزازہ روڈ میں بھیڑ بھاڑ

والے علاقے میں تھی۔ جہاں تھانے والے کو کچھ پیسے دے کر روڈ کے کنارے جھونپڑی ڈال لی تھی۔تھانے میں دو یا تین بار پانچ چھ کپ چائے مفت میں بھجوانی پڑتی تا کہ کوئی سپاہی آ کر اسے پریشان نہ کرے ——— البتہ دو موسموں میں ہزاریکا کی پریشانی میں اضافہ ہو جاتا۔سردی کے موسم میں جب کڑا کے کی سردی پڑتی۔اسکے پاس نہ کوئی لحاف تھا اور نہ کوئی گرم چادر۔پوال کو زمین پر ڈال کر اس پر بورے کا بستر بنا دیتا اور ایک بوسیدہ کمبل میں پتی پتنی اور بیٹی تینوں تن کو ڈھکے رہتے۔لکھمنیا بیچ میں سوتی اس لئے کبھی وہ سمتا کو کمبل سے ڈھاکتی رہتی تو کبھی ہزاریکا کو۔کہرے یا بارش والی رات میں یہ کمبل ناکافی ہوتا۔ایسی صورت میں قریب کے پھل کی دکان سے ٹوٹے بکسے کی لکڑی مانگ کر لے آتا۔اسی کا الاؤ جلاتا اور رات بھر تینوں تاپتے رہتے لیکن برسات کے موسم میں پریشانی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔پھوس کی چھت سے ٹپ ٹپ پانی ٹپکتا رہتا۔ایسی راتوں میں تینوں افراد آنکھوں میں رات کاٹتے۔رات بھر جہاں جہاں سے پانی ٹپکتا وہاں وہاں المونیم کے برتن رکھ کر کچے فرش کو گیلا ہونے سے بچانے کی ناکام کوشش کرتے مگر بے تحاشہ پانی ٹپکنے سے پورا فرش گیلا ہو جاتا اور کہیں پر بھی سونے کی کیا بیٹھنے کی بھی جگہ نہ ہوتی۔اس وقت لکھمنیا اپنی قسمت کو کوستی کہ سارے دکھ ہم غریبوں کے ہی قسمت میں کیوں لکھ دیا گیا ہے۔رات میں سکون سے سو بھی نہیں سکتے۔اسے اپنی یا اپنے پتی کی فکر تو کم ہوتی کیوں کہ دونوں کو دکھ جھیلنے کی عادت سی ہو گئی تھی مگر سمتا کی چنتا اُسے زیادہ ستاتی جب وہ اسکی نیند سے بوجھل آنکھوں میں دیکھتی تو اسکا دل تڑپ اُٹھتا۔وہ تڑپ کر سمتا کو سینے سے لگا لیتی اور گود میں سلانے کی کوشش کرتی مگر چھت سے ٹپکتے پانی کی وجہ کر اسکی نیند میں بھی خلل پڑ جاتا۔

ہزاریکا کی موت نے لکھمنیا کی زندگی میں مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔سب سے بڑا مسلۂ پیٹ کے تندور کو ٹھنڈا کرنے کا تھا۔ہزاریکا زندہ تھا تو دن بھر چائے کی دکان میں سخت محنت کر کے اتنا پیسہ کما لیتا تھا کہ تینوں جون کا پیٹ بھر سکے اور تن ڈھک سکے۔اب لکھمنیا کے سامنے دو وقت کی روٹی کا انتظام بھی مشکل ہو گیا تھا۔یہ سوچ کر اس کا دل بے قرار ہو اُٹھتا۔دل کے ویرانے میں دور دور تک دھول ہی دھول اُڑنے لگتی ہے۔گرم اور سیاہ دھول، کہیں یہ سیاہ بگولہ کسی دن اُسے بھی اپنے ساتھ نہ اُڑا لے جائے ———

''ہے بھگوان ہم کا کریں......کہاں جائیں'' ——— لکھمنیا رو پڑتی ہے۔ ——— ''تم ہم لوگوں کو کیوں چھوڑ کر چلے گئے ہزاریکے......ہمر اب کوئی دھیان دینے والا نہیں۔ہم اس جالم دنیا سے اکیلے کہاں تک لڑ سکیں گے......کب تک مقابلہ کر سکیں گے۔مرد کے بنا عورت کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے......'' وہ روتی رہی سسکتی رہی اور اس مسئلے کا حل تلاش کرتی رہی۔بہت سوچ وچار اور غور و خوض کے بعد بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔

دوسرے دن چائے کی دکان کے چولہے سے دھواں اُٹھنے لگا تھا۔لکھمنیا نے ساڑی کے پلو سے اپنے پورے چہرے کو ڈھک رکھا تھا۔کام کرتے وقت ایک ہاتھ سے آنچل پکڑ کر کام کرتی ——— جب چولہے میں آگ روشن ہو گئی تو اس پر دودھ گرم کرنے کے لئے چڑھا دیا اور برتن کو صاف کرنے لگی۔تھوڑی دیر میں ہی چائے بن کر تیار تھی۔دکان کھلی دیکھ کا اکّا دکّا گاہکوں کا آنا شروع ہو گیا تھا۔لکھمنیا چائے بناتی۔پکوڑے چھانتی اور سمتا گاہکوں کو پکوڑے اور چائے بڑھاتی۔پانی بڑھاتی اور جوٹھے برتن اُٹھا کر اُسے صاف کرتی۔دو چار دن تو لکھمنیا کو بڑا عجیب سا لگا لیکن پیٹ کا جہنم جب اپنا شعلہ اگلتا تو شرم و حیا اس آگ پر غالب آ جاتی۔ایک دو دن اُسے کئی طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

کوئی گاہک کم شکر کی چائے مانگتا، کوئی بغیر شکر کی، کوئی کڑک چائے۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا جاتی۔ اس طرح کام کرنے کی اسے عادت نہ تھی۔ پھر کبھی پکوڑے جل جاتے، کبھی کچّے رہ جاتے۔ لیکن دھیرے دھیرے اُسے سب کرنے کی عادت ہوگئی۔

فرصت کے اوقات میں لکھمنیا سمتا کی خوب سیوا کرتی۔ اپنے ہاتھوں سے نہاتی اسکے بالوں کو سنوارتی، کھانا کھلاتی اور دل کھول کر پیار کرتی۔ وہ اسکے پیار میں اس طرح کھو جاتی جیسے اب وہی اسکی زندگی کا سرمایہ ہے لیکن سمتا کی بڑھتی عمر کو دیکھ کر وہ اندر سے پریشان ہوجاتی۔
دکان میں اوباش قسم کے لڑکے جو چائے پینے کے لئے آتے وہ سمتا کو ہوس ناک نگاہوں سے نہارتے رہتے۔ کوئی پانی کا گلاس لینے کے بہانے سے اسکا ہاتھ پکڑ لیتا۔ کوئی گال میں چٹکی کاٹ لیتا کوئی گندے فقرے اُچھالتا، کوئی گانا گاتا ——— ''آتی کیا کھنڈالا''

لکھمنیا خاموشی سے سب دیکھتی رہتی اور خون کے گھونٹ پیتی رہتی۔ وہ کسی کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ عورت ذات وہ بھی اکیلی۔ کس کس سے جھگڑا کرتی۔ اوباش لڑکے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ رات میں لکھمنیا اپنی چھوٹی سی تاریک جھونپڑی میں دروازہ بند کر کے چپ چاپ فرش پر لیٹ جاتی۔ اب اُسے ہر لمحہ سمتا کی فکر ستاتی رہتی۔ اسکی عزت کا خیال دامن گیر رہتا۔ وہ بڑی ہونے لگی تھی۔ چائے کی دکان پر ہر طرح کے لوگ چائے پینے آتے تھے۔ کسی کی بُری نظر کو، کسی کی نیت کو پہچاننا آسان نہیں تھا۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو وہ اپنے سورگیئے پتی کو بھگوان کے یہاں کیا منہ دکھائے گی۔ سمتا کو وہ کسی بھی طرح دکان سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سمتا اسکے بغل میں گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے سمتا کے سر کو سہلایا۔ کتنی محبت اور کتنی مصیبتوں سے وہ اسکی پرورش کر رہی ہے۔ لکھمنیا کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بہہ گیا۔ جوانی کا خنجر بھی بے سہارا عورت کو لہولہان کر دیتا ہے۔ آج ہزاریکا موجود ہوتا تو اسے سمتا کی اتنی فکر نہ ہوتی۔ وہ دُکان سنبھالتا اور لکھمنیا سمتا کی رکھوالی کرتی لیکن بیک وقت دکان اور سمتا کو سنبھالنا اسکے بس سے باہر تھا۔ تھوڑی دیر بعد لکھمنیا نے آنسو پوچھ لیے اور سمتا کی محفوظیت کے بارے میں سوچنے لگی۔

کچھ وقفے کے بعد وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور ٹاٹ کا پردا ہٹا کر دکان میں آ گئی۔ چولہے میں ابھی بھی ہلکی ہلکی آنچ تھی سڑک پر آوارہ کتے بھونک رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی سائیکل سوار یا رکشے کے گزرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ ایک ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ اسکی آنکھوں سے نیند کا چلمن اُٹھ چکا تھا۔ دل میں طرح طرح کے خیال اور سوال اُبھر رہے تھے۔ لکھمنیا کی آنکھوں میں گھوم پھر کر ایک ہی شخص کی تصویر بار بار اُبھر رہی تھی۔ وہ تھی ماسٹر صاحب کی ———

اُن کا پورا نام رام پریکھا سنگھ تھا لیکن سبھی لوگ انہیں ماسٹر صاحب ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ عمر کی پچاسویں سیڑھی پر قدم رکھ چکے تھے۔ ہائی اسکول میں حساب کے استاد تھے لیکن سائنس اور انگریزی کی بھی کلاس لیتے تھے۔ ویسے تو انکا پورا کنبہ پاس کے ہی ایک گاؤں سعدی پور میں رہتا تھا مگر ماسٹر صاحب کا شہر میں بھی ایک چھوٹا سا مکان تھا جہاں صبح و شام بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ سنیچر کی شام کو وہ گاؤں چلے جاتے اور سمبار کی صبح میں واپس آ جاتے۔ ماسٹر صاحب اسکول جانے سے پہلے اور اسکول سے لوٹنے کے بعد ہزاریکا کی چائے دکان پر ضرور رکتے۔ چائے پیتے۔ ہزاریکا سے خیریت دریافت کرتے اور چلے جاتے۔ اسکی موت کے بعد بھی ماسٹر صاحب کے معمول میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ لکھمنیا سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہوگئی تھی۔ وہ اسکا ہر روز حوصلہ بڑھاتے۔ اسکی ہر ممکن مدد کرتے۔ لکھمنیا کو دوبارہ دکان کھولنے کے لئے ماسٹر

صاحب نے ہی پانچ سو روپئے دیئے تھے۔اس لئے لکھمنیا کی سوچ کا محور ماسٹر رام پریکھا سنگھ ہی تھے۔اگر ماسٹر صاحب سمتا کو اپنی سرپرستی میں لے لیں تو وہ سمتا کی طرف سے اطمنان ہو جائے گی۔جب وہ اس فیصلے پر پہنچتی ہے تو قدرے اطمنان محسوس کرتی ہے اور آہستہ سے آ کر بستر پر لیٹ جاتی ہے۔

دوسرے دن ماسٹر صاحب جب لکھمنیا کی دکان پر چائے پینے آئے تو وہ قدرے جھجھکتے ہوئی بولی ——

''ماسٹر صاحب آپ سے ایک بات کہنی ہے؟'' —— اس وقت دکان میں اکّا دکّا گاہک ہی بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ماسٹر صاحب کو چائے کا گلاس سمتا پکڑا گئی تھی۔

''ہاں ہاں کہو'' —— ماسٹر صاحب ذرا سا سرک کر اسکے قریب آ گئے۔

''ماسٹر صاحب ہمکو ایک چنتا بہت ستا رہی ہے۔'' ---- لکھمنیا نے دکان کے اندر دیکھا۔دونوں گاہک آپسی گفتگو میں مہنمک تھے۔

کیسی چنتا لکھمنیا...... بتاؤ...... اگر ہمارے بس میں ہوگا تو ہم ضرور اُس چنتا کو دور کرنے کی کوشش کرینگے'' —— ماسٹر صاحب نے چائے کی ایک بڑی سی گھونٹ لی۔

''ماسٹر صاحب ہمکو سمتا کی چنتا ہے۔وہ بڑی ہو رہی ہے۔لچّے لفنگے لڑکے چائے پینے کے بہانے دکان میں آ کر اسے بُری نظر سے دیکھتے ہیں اور چھیڑتے ہیں'' —— لکھمنیا نے دھیمی آواز میں کہا۔مگر سمتا جو اسکے پاس اب آ کر کھڑی ہو گئی تھی،اس نے ماں کی بات سن لی تھی۔اس نے ایک نظر ماں کی طرف کی تو دوسری نظر ماسٹر صاحب پر ڈالی کہ اس وشے پر ماسٹر صاحب کیا بولتے ہیں۔ماسٹر صاحب کچھ پل رُک کر بولے ——

''یہ تو واقعی بہت چنتا کی بات ہے'' —— انہوں نے سمتا کی طرف دیکھا۔واقعی وہ بڑی ہونے لگی تھی —— پھر انھوں نے لکھمنیا کی طرف دیکھ کر کہا —— ''آخر تم نے اس سمسیا کا حل کچھ نہ کچھ تو سوچا ہوگا۔تم بتاؤ تو میں بھی اپنا کچھ مشورہ دوں۔''

''ماسٹر صاحب ہمرے دماگ میں تو ایک ہی اُپائے ہے...... وہ ای ہے کہ آپ سمتا کا اپنے اسکول میں نام لکھوا دیں تو دن بھر اسکول میں رہے گی دکان کے ماحول سے دور۔اس کا سے بھی کٹ جائے گا اور کچھ پڑھ لکھ بھی جائے گی۔''

ماسٹر صاحب کچھ دیر تک تمام پہلو پر غور کرنے لگتے ہیں۔اس لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔لکھمنیا کو ماسٹر صاحب کے جواب کا انتظار تھا اور سمتا کو لگ رہا تھا کہیں ماسٹر صاحب منع نہ کر دیں۔جب ماسٹر صاحب کافی دیر خاموش رہتے ہیں تو لکھمنیا پھر بولتی ہے ——

''ماسٹر صاحب کا ای ممکن نہیں ہے۔''

ماسٹر صاحب ایک لمبی سانس لے کر پہلے لکھمنیا کو دیکھتے ہیں پھر سمتا کو ——

''دیکھو لکھمنیا سمتا کی عمر اب بچوں والی نہیں رہی لیکن میرا ماننا ہے کہ پڑھنے لکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔سب سے پہلا مسئلہ تو اسکول میں داخلے کا ہے کہ اسے کس کلاس میں داخلہ کرایا جائے گا۔پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ اسکا داخلہ ہو جائے لیکن اسے بہت محنت کرنی پڑے گی تبھی جا کر اپنی عمر کے حساب سے کلاس پائے گی ورنہ چھوٹے بچوں میں بیٹھ کر پڑھنے سے احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گی۔''

''ماسٹر صاحب آپ چاہیں تو کچھ بھی ناممکن نہں۔ گھر پر آپ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں اگر ایک گھنٹہ سمتا کو بھی سمے دے دیں تو وہ ضرور پڑھ لے گی۔ آپ کی جو فیس ہے...... حالانکہ میں دینے کے لائق نہیں ہوں پھر بھی اپنا پیٹ کاٹ کر کچھ تو دے ہی دوں گی''۔

''پیسے کی کوئی بات نہیں ہے لکھمنیا میں پہلے ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ اگر وہ تیار ہو گئے تو کل ہی میں داخلہ کرا دونگا''—— ماسٹر صاحب نے چائے کا گلاس سمتا کو پکڑا دیا۔

''ماسٹر صاحب گریب کی بیٹی ہے اگر کچھ پڑھ لکھ جائے گی تو میں دعا ہی دوں گی۔ اس نے بیسن سے سنے دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔

''لکھمنیا میں ہر ممکن کوشش کروں گا سمتا پڑھ لکھ لے۔ اچھا اب چلتا ہوں۔ شام کو اسکے بارے میں بتاؤں گا''

ماسٹر صاحب کے اشواسن سے لکھمنیا کو اطمنان ہو جاتا ہے۔ لیکن سمتا کے چہرے پر پرسنتا کے پھول کھل جاتے ہیں۔ سمتا چاہتی تھی کہ وہ بھی اسکول دیکھے، دوسرے بچوں کی طرح پڑھے لکھے۔ اسکول کا یونیفورم پہنے اپنے کندھے پر اسکول کا بستہ اُٹھائے اور خوب دل لگا کر پڑھے۔ اس نے من ہی من میں سوچ لیا کہ وہ خوب دل لگا کر پڑھے گی اور اپنی عمر کی جماعت میں جلد پہنچ جائے گی۔

ماسٹر رام پریکھا سنگھ کی انتھک کوششوں سے سمتا کا داخلہ اسکول میں ہو گیا۔ اب وہ اسکول جانے لگی۔ ماسٹر صاحب اسکول جانے سے قبل جب لکھمنیا کی دکان پر چائے پینے آتے سمتا اسکول جانے کے لئے تیار ملتی۔ وہ اسے ساتھ اسکول لے جاتے اور شام کو اسکول سے لوٹتے وقت چھوڑ جاتے۔ سمتا کھا پی کر کچھ دیر کے بعد ماسٹر صاحب کے گھر چلی جاتی۔ ماسٹر صاحب اسکول کا ہوم ورک کروا دیتے سبق بھی یاد کرا دیتے اور خود اُسے گھر تک چھوڑنے آتے۔

لکھمنیا اب خوش تھی کہ اسکی بیٹی محفوظ ہے۔ صبح سے لے کر شام تک اس ماحول سے الگ رہتی ہے اس لئے اب کوئی اس پر بُری نظر بھی نہیں ڈالتا۔ اوباش قسم کے لڑکے جو صرف سمتا کے لئے چائے پینے آتے تھے اب آنا بند کر دیا تھا۔ سمتا کا دکان میں نہ رہنے سے لکھمنیا کے اوپر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ اب وہ چائے پکوڑے بھی بناتی۔ گاہکوں کو بھی بڑھاتی برتن بھی صاف کرتی۔ مگر اسکے چہرے پر ذرا بھی پریشانی کی لکیر نہیں اُبھرتی بلکہ خوشی کا تیج چمکتا نظر آتا کہ سمتا اب محفوظ ہے اگر وہ کچھ پڑھ لکھ جائے گی تو چائے کی دکان میں نہیں بیٹھے گی بلکہ کوئی اچھا کام کرے گی۔ پڑھ لکھ جانے کی وجہ کر اسے اچھا ور بھی مل جائے گا۔

سورج ڈوب چکا ہے۔ چاروں سمت دھندلکا دم بہ دم گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ لکھمنیا دکان بند کر کے آرام سے اپنے دونوں پاؤں پھیلائے بیٹھی ہے۔ وہ بے فکر ہو کر اطمنان کی سانس لے رہی ہے۔ اب اسکے سیاہ بالوں میں چاندی کے ایک دو تار نظر آنے لگے ہیں اور ادھر سمتا پر چپکے چپکے دبے پاؤں جوانی دستک دے رہی ہے۔ سمتا کے جسم کے نقش و نگار اُبھر آئے ہیں۔ اُسکے کانوں میں اب انجان سی سرگوشیاں سنائی دینے لگی ہیں۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہونے لگی ہے۔ بدن سے باس اُٹھنے لگا ہے لیکن وہ پڑھنے لکھنے میں ذرا بھی غفلت نہیں برتتی ہے۔ دل لگا کر محنت سے پڑھائی کرتی ہر روز ماں کو طرح طرح کی کہانیاں سناتی۔ انگریزی کے الفاظ بولتی تو لکھمنیا آواک سی اسکا منھ تکتی۔ کبھی ہندی کے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتی تو لکھمنیا کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا لیکن وہ دل ہی دل میں خوش ہوتی کہ اسکی بیٹی من لگا کر پڑھ رہی ہے اور ماسٹر صاحب کی بے حد شکور ہوتی کہ انہوں نے سمتا کو اس لائق بنا دیا کہ اسکے طور طریقے، بول چال، رہن سہن سب میں تبدیلی آ گئی ہے۔ وہ بات

بات پر ماں کوٹوکتی کہ ماں ایسے بیٹھو، ایسے بولو، ایسے کھاؤ، لکھمنیا ہنس دیتی——

''بیٹی اب نہیں بدل سکتی۔ بچپن سے ہمکو ایسا ہی سنسکار ملا ہے۔ تو نئے زمانے کی پڑھی لکھی لڑکی ہے تیرے سنسکار بدل جائیں گے۔''

''سمتا تنک کر کہتی——ماں سنسکار بدلنے کے لئے عمر کی کوئی سیما نہیں ہوتی۔ مجھے دیکھو میں نے کتنی زیادہ عمر میں پڑھنا لکھنا شروع کیا اور کتنی جلدی سب کچھ سیکھ گئی۔''

''لیکن بیٹی اس میں تیرے ماسٹر صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ جنہوں نے تجھے محنت سے پڑھایا، لکھایا اور تجھے اس قابل بنایا۔''—— لکھمنیا کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

''ماں واقعی ماسٹر صاحب بہت اچھے ہیں۔ وہ اس طرح پڑھاتے ہیں کہ ہر بات دماغ میں کمپیوٹر کی طرح فٹ ہو جاتی ہے۔''—— سمتا کے چہرے پر تیج تھا۔

''بھگوان کرے تو پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے تو میری تپسیا پوری ہو جائے''۔

''ماں میں کچھ بن کر ضرور دیکھاؤں گی۔''——سمتا نے مٹھی باندھ کر ہوا میں لہرایا۔

''بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔''—— لکھمنیا اُٹھ کر بستر لگانے لگی۔

لکھمنیا اب بے حد خوش تھی کہ وہ سمتا کو چائے کی دکان کے ماحول سے الگ رکھ کر ایک اچھا شہری بنا رہی ہے۔ لکھمنیا حسب اوقات اسکی ہر خواہش کی تکمیل کرتی۔ کتاب، کاپی، کپڑا۔ لیکن ماسٹر صاحب بھی کم مدد نہیں کرتے اچھی اچھی کتابیں خرید کر دیتے مہنگی کتابیں اپنے گھر سے دیتے۔ کچھ کتابیں لائبریری سے دلوا دیتے۔ اس طرح سمتا کے حصول تعلیم میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

لکھمنیا کئی دن سے دیکھ رہی تھی دو پولس والے اکثر رات میں اسکی دکان پر چائے پینے آتے اور کافی دیر تک کھڑے رہ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے یہ دونوں قریب کے تھانے کے سپاہی تھے۔ دونوں کی نظریں دکان کے اندر بنی جھونپڑی کی طرف ہوتی۔ پہلے تو لکھمنیا سمجھ نہیں پائی کہ یہ پولس والے جھونپڑی کے اندر کیا تلاش کرتے ہیں لیکن آج تو حد ہو گئی۔ چائے پینے کے درمیان دونوں پولس والے سرگوشی کے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک پولس والا جھونپڑی کے اندر جھانکتے ہوئے دھیرے سے بولا——

''آج کل اسکی چھوکریا نظر نہیں آتی ہے۔ لگتا ہے کسی دھندے پر لگا دیا ہے۔''

دوسرا پولس والا بھی اندر جھانکا——

''ارے یہ لوگ اور کس دھندے پر لگائے گی۔ زیادہ پیسہ کمانے کا بس ایک ہی دھندا ہے۔''

''تو کا ہمکو بھی پیسہ دینا پڑیگا ہیرالال''

''نہیں بنسی تو بھی کا بات کرتا ہے۔ اسکو دکان یہاں رکھنا ہے کہ نہیں۔ رات میں گشت لگانے کے درمیان موقع دیکھتے ہی اندر گھس جائیں گے۔ بس کام تمام''۔

دونوں پولس والے چائے پی کر وہاں سے چلے گئے۔ لکھمنیا جو ان لوگوں کی گفتگو پر ہی کان لگائے تھی جہاں تہاں سے کچھ الفاظ اسکی سمجھ

میں آیا تھا مگر آخری جملہ چونکہ کچھ زور سے کہا گیا تھا اس لئے اس جملے کو سن کر اندر تک کانپ گئی۔ بات اسکی سمجھ میں آ گئی تھی کہ دونوں پولس والے سمتا کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور دونوں کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ یہ پولس والے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر کسی رات چھونپڑی کے اندر گھس گئے تو وہ اکیلی جان کیا کر پائے گی۔ اسکی عزت تو جائے گی ہی سمتا کی بھی عزت لٹ جائے گی۔ پولس والے کا خوف اسکے اندر سرایت کر گیا تھا۔ وہ سمتا کے تحفظ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی سوچتے سوچتے بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ماسٹر صاحب کا مکان ہی سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ وہ ماسٹر صاحب کو کہے گی کہ سمتا کو اپنے گھر میں ہی کسی کونے میں جگہ دے دیں جہاں وہ رات گزار سکے۔ اُسے اب اپنے ساتھ رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہے—— یہ سوچ کر وہ قدرے اطمنان محسوس کرتی ہے چائے کی دکان جلدی جلدی بند کرتی ہے حالانکہ ابھی ساڑھے آٹھ ہی بجے تھے۔ روزانہ وہ نو بجے دکان بند کرتی تھی۔ سمتا کے آنے کا وقت بھی وہی تھا۔ وہ یہ سوچ کر دکان جلد بند کر دی کہ آج ہی سے وہ سمتا کو ماسٹر صاحب کے گھر میں رہنے کا انتظام کر دے گی۔ دکان بند کر کے وہ ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف چل پڑی۔

ماسٹر صاحب کا گھر باہر سے کھلا ہوا تھا۔ لکھمنیا اندر داخل ہو گئی۔ صحن سے ہوتے ہوئے ماسٹر صاحب کے کمرہ تک وہ پہنچ گئی۔ کمرہ کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس نے پردہ ہٹا کر جیسے ہی کمرہ میں قدم رکھا اندر کا منظر دیکھ کر اس پر سکتہ طاری ہو گیا گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ذہن ماؤف اور ہاتھ پاؤں جیسے شل ہو گئے ہوں۔ اس نے دیکھا۔

سمتا اور ماسٹر صاحب ادھ ننگے ایک ہی بستر پر سوئے ایک الگ ہی پاٹھ پڑھ رہے تھے۔

●●

شاخِ نازک پر۔۔۔

کہیں نہ کہیں کوئی گھڑی ایسی ہوتی ہے——'

جس میں سے دھواں نکلتا رہتا ہے۔

مدھم، مدھم،

کچھ کراہیں، کچھ آہیں۔

بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔

سلمٰی لوٹ آئی ہے۔ اُس گھر میں جہاں زندگی کو ہر روز ایک سزا کی مانند جھیلنا پڑتا ہے جس میں وہ اپنے شوہر ندیم اور چھوٹی بہن شمیمہ کے ساتھ رہتی ہے لیکن سلمٰی——

گھر لوٹنے کے بعد اچانک اُسے محسوس ہونے لگا کہ خوشی اس کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ ابھی ابھی تو اس کے پاس تھی۔ صرف چند ہفتوں میں اتنی بڑی تبدیلی—— اُس کا دل دھڑکا، ایک لمحہ، اس کے احساس پر دھپ سے کوئی چیز گری اور وہ سہم گئی—— ندیم مجھ سے کھنچا کھنچا کیوں رہتا ہے؟—— اس نے سوچا—— کیا اُن دونوں میں کوئی تعلق ہے؟—— کوئی رشتہ؟—— یار شتوں کے درمیان خلا سا پیدا ہو گیا ہے؟

سلمٰی بہت دیر تک اپنے آپ سے پوچھتی رہی اور جواب نہ پا کر الجھتی رہی——'

منہہ اندھیرے جب وہ کوٹھری سے باہر آئی تو اُسے اپنا ہی گھر بیگانہ لگا، آنگن میں آ کر اس کے پاؤں رک گئے۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ شمیمہ کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ اس سے پہلے ہی اُٹھ کر گھر کی صفائی میں مصروف تھی——' اسے تعجب بھی ہوا مگر خاموش رہی۔

سلمٰی خوبصورت تھی، ابتدائی تعلیم بھی اس نے حاصل کی تھی۔ شمیمہ بھی پڑھی لکھی تھی لیکن ندیم بالکل ناخواندہ تھا۔ اُس کا اپنا ایک چھوٹا سا بزنس تھا۔ بزنس چلتا خوب تھا۔ اس کا اپنا ایک مکان بھی تھا اور آرام و آرائش کی تمام چیزیں۔ سلمٰی سے ایک بچہ بھی تھا—— پھر بھی شمیمہ ابھی تک واپس نہیں گئی تھی—— کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ شمیمہ ندیم کے گھر، بیوی کی طرح رہ رہی تھی اور اس کا بھی

اسِ گھر پر اتنا ہی اختیار تھا جتنا سلمیٰ کا ـــــــ لیکن سلمیٰ ـــــــ؟

سلمیٰ اندر ہی اندر ایک جنگ لڑ رہی تھی ـــــــ'

وہ سارا دن بے چین رہتی۔ پورے گھر کا بلا وجہ چکر لگاتی رہتی۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک جاتا۔ یہ نئی بات جو ظہور میں آئی تھی اُسے ہر لمحہ پریشان کیئے ہوئے تھی گرچہ ندیم کے لئے معمولی بات ہو سکتی ہے لیکن سلمیٰ کی بے چینیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بے قراری اس کے ذہن کو کہاں کہاں بھگائے پھرتی۔ وہ ذرا سا بھی ٹھہر کر اپنے ذہن کو آرام نہ دیتی۔

اس گھر میں تیسرا اور تھا کون جو اس جنگ کے بارے میں جانتا یا جاننے کی کوشش کرتا۔ ندیم کو اپنے بزنس سے فرصت نہ تھی اور شمیمہ نے گھر کی ساری ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لی تھی۔ اس نے سلمیٰ سے کہا تھا ـــــــ

''باجی آپ آرام کیجئے، خوب سیر و تفریح کیجئے۔ ایک بار خواجہ صاحب کے دربار ہو آیئے۔ اس طرح دہلی، آگرہ بھی گھوم آیئے گا اور سارے آستانوں پر حاضری بھی ہو جائے گی۔''

سلمیٰ نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اُسے اس طرح وقت سے پہلے ہی ریٹائر کر دیا جائے گا۔ اس نے تو ابھی بہت سارے خواب اپنی پلکوں پر سجا رکھے تھے۔ دن بھر گھر کا کام خود کرے گی، جب اس کا شوہر گھر لوٹے گا تو اس کی خوب خدمت کریگی۔ زندگی کتنی خوشگوار گزرے گی لیکن یہ سب کچھ نہ تھا، بس ایک مرتبہ اسپتال میں داخل کیا ہوئی گویا اس کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا گیا ـــــــ

سلمیٰ ماں بننے والی تھی تو مائیکے سے اس نے اپنی بہن شمیمہ کو بلا لیا۔ مائیکے میں اس کی دو بہنیں اور تھیں رقیہ اور زرینہ ـــــــ کیا شمیمہ کو بلا کر اس نے گناہ کیا تھا ـــــــ؟

اس کی نم ناک آنکھیں کچھ محسوس کر کے پھیلتی ہیں۔ آنکھوں میں دھند، جہاں تہاں سے چھٹتی ہے، لمحہ بھر بعد پھر خیمہ تان دیتی ہے۔ افسردہ آنکھیں اپنے آپ ڈوب جاتی ہیں اور گہرے اندھیرے میں کچھ ڈھونڈتی ہوئی بے قراریوں کا زہر گھونٹ لیتی ہیں۔ دل کی بات کون جانے ؟ آہ بھی نکلتی ہوگی، دھواں بھی اُٹھتا ہوگا، اندر ہی اندر ریت کے بگولے اُڑتے ہوں گے مگر باہر سے کتنی شانت رہتی تھی وہ۔

سلمیٰ کے والدین حیات تھے، والد صاحب کا معمولی کاروبار تھا۔ جب شمیمہ کچھ دنوں کے لیے ندیم کے گھر گئی تو گویا یہ بھی خاندان کا بھلا ہی تھا ـــــــ'

ڈاکٹر نے سلمیٰ کو آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اس لیے شمیمہ اسے بستر سے اُٹھنے تک نہیں دیتی اور سارے گھر کی ذمہ داری خود سنبھالتی۔ اُس نے اوپر کا کام کرنے کے لیے ایک نوکرانی بھی رکھ لی تھی اور پھر ندیم کی دلچسپی شمیمہ میں بڑھتی گئی ـــــــ!

کل اور آج میں کتنا فرق ہو گیا ہے ـــــــ'

جہاں کل سلمیٰ کی زندگی میں ہر طرف شور، میلہ سا لگا رہتا تھا۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ـــــــ مگر اب جیسے اُس کے اوپر ایک بجلی سی گری تھی اور سارے تماشے، ساری خوشی اور تمام شادابی خاکستر کر کے چلی گئی تھی، تماشہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا دور تک پھیل گیا تھا اور اب وہ اس کا ایک حصہ بنتی جا رہی تھی۔ وہ آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے جیسے وہ ابھی ابھی خواب سے بیدار ہوئی ہے۔

گزرے ہوئے لمحات اب خواب ہی تو بن گئے تھے۔ ایسے بھی کوئی آنکھیں پھیرتا ہے اور اس کی اپنی بہن ہی اس کی آنکھ کا کانٹا بن گئی تھی۔ اس کی خوشی، اس کی تمناؤں پر ڈاکہ ڈالا تھا اور وہ محض تماشائی بن کر رہ گئی تھی ——— '
شمیمہ خوبصورت تھی اور اس نے اپنے حسن کے جادو سے ندیم کو گرویدہ کر لیا تھا۔ اس کے دل میں بھی ایک آرزو چپکے چپکے پیدا ہو رہی تھی۔ ایک چنگاری تھی جو آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی۔ ایک شوق تھا جو ہر لمحہ اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگتا۔ اس آرزو، اس شوق اور اس چنگاری کو کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔

جب سلمیٰ ماں بن کر اسپتال سے لوٹی اور صحت یاب ہوگئی تو اس نے شمیمہ کو گھر واپس بھیجنا چاہا تو اس نے جانے سے انکار کر دیا اور ندیم بھی اُسی کی طرف داری کرنے لگا۔ پھر سلمیٰ نے گویا زہر پینے کی عادت ڈال لی۔ خاموش اپنے کمرہ میں پڑی رہتی یا کوئی رسالہ ناول پڑھتی رہتی......اب تک وہ جس زمین پر کھڑی تھی، وہ زمین نہیں تھی بلکہ ایک سخت تخت تھا جس کو کسی نے آہستہ سے اس کے پیروں کے نیچے سے کھینچ لیا تھا اور اب وہ زمین کے اندر دھنستی چلی جا رہی تھی جیسے زلزلہ آنے کے بعد مکمل عمارت زمین کے اندر چلی جاتی ہے۔

سلمیٰ نے باہر نکل کر گلی کی طرف دیکھا جو سنسان اور تاریک تھی۔ وہ فوراً اپنے کمرہ میں لوٹ آئی۔ کمرہ میں بلب کی مدھم روشنی نے کمرہ کو نیم روشن کر رکھا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ چلتی ہوئی پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے دل میں ایک آگ سلگ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ——— رفتہ رفتہ ——— دھیرے دھیرے ——— خاموش سی! ——— جس میں اس کا وجود لمحہ لمحہ جل کر راکھ ہو رہا تھا۔ رات کی سیاہی چہار سمت پھیل چکی تھی۔ ہوا کے سہارے ریشم کے پردے لہرا رہے تھے۔ چاروں طرف ایک نامعلوم اُداسی نے گھر کر لیا تھا۔
وہ بے دلی سے کھڑکی کا پٹ بند کرنے کے لئے اُٹھی۔ اس کے قدم من من بھر کے معلوم پڑ رہے تھے۔ دل بجھا بجھا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ سڑک پر اکّا دکّا لوگ آ جا رہے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے کئی پل کھڑی رہی۔ کمرہ میں گہرا سناٹا پوری طرح مسلط ہو گیا تھا۔ وہ کھڑکی بند کر کے پھر پلنگ کی طرف لوٹ آئی اور بستر پر دراز ہوگئی۔ وہ خواب کی پنگھٹ پر نہ جانے کتنی دیر تک اپنی آنکھیں بند کر کے گزرے اور بھولے مناظر کو موتیوں کی طرح اپنے دامنِ احساس میں بھرتی رہی لیکن جب آنکھ کھلی تو سارا منظر دھواں دھواں تھا کہیں کوئی شبیہ تھی نہ عکس! ——— وہ ایسے سفر پر تھی جہاں راستے تھے نہ مسافر ——— دھوپ تھی نہ شام ——— بس ایک خواب جیسی دھند تھی اور پہاڑ جیسی رات جس کے آخری سرے پر وقت کندہ تھا اور وقت کی ہتھیلی پر لکیریں تھیں۔ بے حس لکیریں جو بے نام سی تھیں۔ سلمیٰ نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی ہتھیلی پھیلا دی اور ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگی ——— یہ لکیریں کیا ہیں؟ ——— ایک کھیل ہی تو ہے اور اس کھیل میں سلمیٰ بس ایک تماشائی بن کر رہ گئی ہے ——— اس کی خوشیوں کا شہر جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ وہ ان پتھروں کے درمیان صدا لگا رہی تھی مگر اس کی آواز صدا بہ صحرا ہوگئی تھی ——— سلمیٰ نے ندیم کو بار ہا پکارا لیکن وہ خاموش ہی رہا کہ خاموشی میں ہی اس کی عافیت تھی۔
وہ بہت دیر تک آسمان کو تکتی رہی۔ شاید اسے گمان تھا کہ آسمان سے کوئی موسمِ بہار اترے گا اس کے لئے، جو اس کی زندگی میں گلاب کھلا دے گا لیکن یہ محض اس کا گمان تھا کیونکہ اب آسمان پر اس کا چاند نہیں تھا بلکہ اس کا چاند تو شمیمہ کے کمرہ کو روشن کر رہا تھا۔
رفتہ رفتہ سلمیٰ کی مٹھیوں سے یادیں ریت کی طرح نکلتی چلی گئیں۔ قربتوں کا موسم خزاں آلود ہو گیا۔ سبھی تابندہ ستارے ٹوٹ چکے اور دور تک

صرف ظلمتوں کی حکومت قائم ہوگئی اور جب ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو وہ ایک دن کسی کو کچھ بتائے ہی گھر سے غائب ہوگئی۔۔۔۔۔۔‘

شمیمہ اب بہت خوش تھی۔اس کے گھر کے آنگن میں اب دھوپ ہی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔اس نے روشندان کھڑکیاں اور دروازوں کے پٹ سب کھول دیے تھے کہ اب وہ آزاد تھی اور اسے کسی کا خوف نہیں تھا۔۔۔۔۔۔اس درمیان شمیمہ بھی اسپتال جانے کے قابل ہوگئی۔اسے یقین تھا کہ اب، جب اس کی گود بھر جائے گی سلمیٰ واپس آ کر بھی اسے گھر سے قانونی طور پر نہیں نکال سکے گی۔

وقت تو بہتا ہوا دریا ہے...... بہتا ہی جاتا ہے......جس میں کتنی آرزوئیں......تمنائیں......حسرتیں......سب بہہ جاتی ہیں اور انسان ساحل پر کھڑا سب کچھ گزرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہ جاتا ہے اور وقت اس کے حصے میں صرف اور صرف یادیں چھوڑ جاتا ہے اور یہی یادیں اس کی زندگی کا سرمایہ ہوتی ہیں۔

شمیمہ جب اسپتال سے لوٹی تو اس نے دیکھا کہ تیسری بہن رقیہ بڑے والہانہ انداز میں ندیم کا گھر سنبھالے ہوئے تھی۔۔۔۔۔۔اور ندیم اُس کے آگے پیچھے جھول رہا تھا۔۔۔۔۔۔!

●●

سوانگ

وہ جس شہر میں بھی جاتا اپنی کلاکاری سے ہنگامہ برپا کردیتا۔کمال کا بہہ روپیہ تھا۔بھیش بدلنے میں ماہر۔وہ جس بھیش میں بھی شہر میں نمودار ہوتا پہلے تو لوگ یقین ہی نہیں کرتے کہ یہ بہہ روپیہ ہے مگر وہ خود ہی ہنس کر یا ہاتھ جوڑ کر بتادیتا کہ وہ بہہ روپیہ ہے۔تب لوگوں کے چہرے پر ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑتے۔

بھیش بدل کر کسی کو ہنسانا ایک مشکل فن ہے لیکن یہ اسکا خاندانی پیشہ تھا۔اس کا باپ بھی بہہ روپیہ تھا اور اب اسکی موت کے بعد اسی فن میں اسکا اترادھیکاری بن گیا تھا۔وہ کسی بھی شہر میں دس دن سے زیادہ نہیں رکتا۔دس دن میں دس طرح کے بھیش بدلتا اور لوگوں کا منورنجن کرتا۔آخری دن وہ شہر کی دکانوں اور گھروں سے پیسے وصول کرتا۔اس طرح اسکی اچھی آمدنی ہوجاتی تھی۔

جب وہ میرے شہر میں نمودار ہوا تو اتفاقاً میرے محلے میں ہی ایک کمرہ کرایہ پر لے کر رہنے لگا۔ایک دو دن تک اُسے شہر کے اعلیٰ حکام سے اجازت وغیرہ لینے میں لگ گیا پھر وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگا۔

آج وہ ہنومان کا روپ دھارن کیا تھا۔لمبی پونچھ لگائے بدن پر بھبھوت ملے اور چہرے کو میک اپ کر کے اس طرح گدا گھماتا ہوا نکلا کہ پہلے تو لوگ ڈر گئے لیکن پھر اس نے مسکرا کر اور ہاتھ جوڑ کر بتایا کہ وہ بہہ روپیہ ہے۔بچے اسکے پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔شام کو جب وہ پورے شہر کا چکر لگا کر لوٹا میک اپ اُتارا اور ایک چائے کی دکان پر آیا تو میں بھی وہاں چائے پی رہا تھا۔دو چار بچے دور کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ یہی صبح میں ہنومان بنا تھا۔لوگوں نے بتایا کہ یہ بہہ روپیہ ہے اور آج ہنومان کا روپ دھارا تھا۔میں اُسکے قریب آ گیا۔

’’کیا میں آپکا نام جان سکتا ہوں؟‘‘

’’جی مجھے اشفاق احمد کہتے ہیں اور آپ؟‘‘

’’میں ایک صحافی ہوں حسین نام ہے میرا‘‘ ______ میں نے ہاتھ بڑھایا اس نے بھی اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

’’آپ سے مل کر خوشی ہوئی‘‘ ______ اس نے ہنس کر کہا۔

’’کہاں کے رہنے والے ہیں؟‘‘میں نے اسے بغور دیکھا۔

’’آگرہ گھر ہے میرا۔فیملی وہیں رہتی ہے۔میں تو شہر شہر نگر نگر بنجارے کی طرح گھومتا رہتا ہوں‘‘______اسکے چہرے پر دکھ کے آثار نمایاں تھے۔

’’آج تو میں نے آپکا روپ نہیں دیکھا لیکن کل ضرور دیکھوں گا۔لوگ بڑی تعریف کر رہے ہیں کہ آپ نے بہت ہی اچھا اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔‘‘______میں نے اسکے فن کی تعریف کی۔

’’جناب یہ تو میرا پیشہ ہے۔روز کا یہی کام ہے۔اس میں کوئی کمال نہیں۔‘‘______اسکے چہرے سے اعتماد جھلک رہا تھا۔

’’پھر بھی لوگوں کو ہنسانا بڑے کمال کی بات ہے اس پژمردہ اور بے حس زمانے میں اگر کوئی ایک پل کے لئے ہنسا دیتا ہے تو یہ اسکے ہنر میں شمار ہوتا ہے‘‘______اشفاق نے مجھے متاثر کیا تھا۔

’’نوازش جناب۔آپ نے میری تعریف کی۔ورنہ لوگ فنکار کی فنکاری پر ہنس تو دیتے ہیں لیکن تعریف کے دو الفاظ ادا نہیں کرتے۔ اچھا چلتا ہوں۔کل کی تیاری کرنی ہے‘‘______وہ پلٹتا ہے۔

’’کل کون سا روپ اختیار کریں گے۔‘‘

’’پہلے سے بتانا بہتر نہیں۔جب آپ دیکھیں گے خود سمجھ جائیں گے۔‘‘______اس نے مڑ کر جواب دیا اور اپنے کمرہ کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے دن میں جیسے ہی ناشتہ سے فارغ ہوا‘کسی نے میرا کال بیل دبا دیا۔گھنٹی کی آواز سن کر میں باہر آیا تو دیکھا ڈاکیہ کھڑا ہے۔

’’صاحب آپکی رجسٹری‘‘______ڈاکیہ نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا۔مجھے حیرت ہوئی کہ ابھی اگیارہ ہی بجے ہیں اور ڈاکیہ ڈاک لے کر آ گیا اکثر میرا ڈاکیہ ایک بجے تک میرے گھر تک پہنچتا ہے۔پھر سوچا ہو سکتا ہے ڈاک کم ہو گی اس لئے جلد آ گیا۔میں نے لفافہ لے کر اس پر پتہ دیکھا۔ پتہ میرا ہی تھا لیکن بھیجنے والے کا نام واضح نہیں تھا۔صرف ممبئی لکھا تھا۔ڈاکیہ نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔جس پر مجھے دستخط کرنے تھے۔میں نے دستخط کر کے جیسے ہی پلٹنا چاہا اس نے مسکرا کر میرے ہاتھ سے وہ لفافہ لے لیا اور ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا______

’’صاحب مجھے اشفاق احمد بہہ روپیہ کہتے ہیں‘‘______وہ مسکراتا ہوا میرے دروازے سے چلا گیا اور میں حیرت میں ڈوبا رہ گیا کہ کمال کی فنکاری دکھائی ہے۔مجھے ذرا بھی شک نہیں ہو سکا کہ یہ بہہ روپیہ ہے میں کافی دیر تک اُسکے بارے میں سوچتا رہا پھر اپنے کمرہ میں پلٹ آیا۔

ایک دن اس نے پاگل کا روپ دھارن کیا۔اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ واقعی پاگل ہے۔بال بڑھے ہوئے۔بڑھی ہوئی داڑھی پھٹے ہوئے کپڑے ناخن بڑے بڑے۔ہنستا تو ایسا لگتا کہ کوئی پاگل ہنس رہا ہے۔کبھی چلّاتا______

’’ہاہاہا میں ہندوستان کی تقدیر بدلنے والا ہوں میرے ہاتھ میں ایک ایسا ریموٹ ہے جس کا بٹن دباتے ہی غریبی دور ہو جائے گی۔ہر شخص کے پاس مکان ہو جائے گا۔ہر آدمی کے پاس کار ہو گی۔آدمی آدمی کا غلام نہیں ہو گا۔کوئی مجبور و بے بس نہیں ہو گا۔ہاہاہا......‘‘

میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔اتنی اچھی اداکاری تو کوئی ایکٹر بھی نہیں کرتا______اس طرح وہ کئی دن تک کئی روپ دھارن کرتا رہا۔کبھی تو میں دیکھ پاتا اور کبھی مصروفیت کی وجہہ کرنہیں دیکھ پاتا لیکن شام کو روزانہ اشفاق احمد سے ملاقات چائے کی دکان پر ہو جاتی۔ایک دن میں نے کہا______

''اشفاق بھائی آپ نے کبھی کسی نیتا کا روپ دھارن کیا ہے؟''

''نہیں صاحب،ابھی تک تو نہیں کیا ہے''______اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''تو پھر کل کسی نیتا کا روپ دھارن کرو۔میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس روپ میں تمہارا کیسا مظاہرہ رہتا ہے''

''ٹھیک ہے صاحب میں کوشش کروں گا لیکن یہ میرا پہلا تجربہ ہوگا''۔

چائے پی کر میں اپنے کمرہ میں لوٹ آیا۔رات کے آٹھ بج رہے تھے۔میں اپنے کمرہ میں لکھنے میں مصروف تھا تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔دروازہ کھولا تو سامنے اشفاق احمد کھڑا تھا۔

''کہو اشفاق بھائی کیسے زحمت کی''۔

''کل کے لئے مجھے کچھ آدمی چاہئے''______اسکے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ کچھ نیا کر دِکھانا چاہتا ہے۔

''کیسے آدمی۔''______میں بھی اسکی بھرپور مدد کرنا چاہتا تھا۔

''جِسے تھوڑی بہت بھی ڈرامے وغیرہ سے دلچسپی رہی ہو اور جو کل میرے ساتھ پورا وقت دے سکے''______پتہ نہیں اس نے کل کے لئے کیا تیاری کی تھی۔

''میری نظر میں ہیں ایسے کئی آدمی۔میں ابھی بات کرتا ہوں''

میں نے موبائیل پر نمبر ڈائیل کر کے ایک ناٹک گروپ سے بات کی۔وہ لوگ تیار ہو گئے۔میں نے یہ بھی بتا دیا کہ کل کے اخبار میں اچھا کیوریج بھی دوں گا______اشفاق احمد خوش ہو کر لوٹ گیا۔

میں بارہ بجے تک کے.پی.روڈ پہنچ گیا۔ایک دکان کے سامنے اپنی موٹر سائیکل اسٹینڈ کی اور چائے پینے لگا۔الیکشن کا زمانہ تھا۔شہر سے کئی اُمیدوار کھڑے تھے۔اور سبھی اپنے اپنے پرچار میں مصروف تھے۔

تبھی دیکھا ایک لیڈر کا قافلہ آرہا ہے۔لیڈر کھدّر کا کرتا پیجامہ اور اچکن پہنے ہوئے ہے۔اسکے ہاتھ میں موبائیل ہے جس سے وہ بات کر رہا ہے۔اسکے اگل بغل دو بندوق دھاری بوڈی گارڈ چل رہے ہیں۔اُسکے پیچھے اسکا پی.اے.ہے جو ڈائری اور فائیل ہاتھ میں تھامے ہوئے ہے۔ایک دو آدمی برسر اقتدار پارٹی کا جھنڈا لئے ہوئے ہیں۔ایک آدمی نعرہ لگا رہا ہے۔باقی لوگ اسکا ساتھ دے رہے ہیں۔

''نگرودھا یک کیسا ہو''

''مہندر یادو جیسا ہو''

نیتا ایک زیور کی دکان میں پرویش کرتا ہے اور اپنے پی.اے.سے کہتا ہے______

''پانچ ہزار کی رسید کاٹو پارٹی فنڈ کے لئے۔''

پی.اے.ایک رسید نکال کر چندہ کاٹنے لگتا ہے۔دکان کا مالک لیڈر کو دیکھتا ہے پھر اسکے ساتھ بوڈی گارڈ کو اور آخر میں پارٹی کے جھنڈے کو۔ برسر اقتدار پارٹی کا لیڈر سمجھ کر چندہ دے دیتا ہے۔لیڈر دکان سے نکل کر دوسری دکان میں داخل ہو جاتا ہے۔زیور کا مالک حیرت سے اپنے مینجر سے پوچھتا ہے۔

''یہ کون نیتا آ گیا......اس شہر سے تو سر جو یادو کو ٹکٹ ملا ہے۔اُسی پارٹی کے ٹکٹ پر یہ دوسرا آدمی کیسے میدان میں اتر گیا۔''_______ اس نے حیرت سے لیڈر کے قافلے کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''مالک آپکو معلوم نہیں کہ پچاس پچاس لاکھ روپیہ دے کر اس بار لوگوں نے ستہ دھاری پارٹی کا ٹکٹ حاصل کیا ہے۔پارٹی نے پیسہ لینے کی غرض سے ایک ہی شہر میں دو امیدواروں کو ٹکٹ دے دیا۔اب آپس میں لڑو۔جو جیتا وہی سکندر۔''_______ سیاست پر اسکی نظر کافی گہری تھی۔

''لیکن مصیبت تو ہم بزنس مین پر آتی ہے۔جو آئے گا الیکشن کے نام پر چندہ اکھٹا کرے گا''_______ اسکے چہرے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

''یہی تو جمہوریت ہے صاحب' جب ہر چیز کی آزادی ہے تو گن کی نوک پر چندہ وصولنے کی بھی آزادی تو ملنی ہی چاہئے''_______ اس نے طنز کا ایک تیر چھوڑا۔

''اس دیش کا بھگوان ہی مالک ہے۔''_______ دکان کا مالک اوپر سر اُٹھا کر ہاتھ جوڑ دیتا ہے۔

میں نے دیکھا وہ لیڈر اسی طرح کئی دکانوں سے چندہ وصول کر رہا ہے۔جب وہ میرے قریب آیا تو میں نے پہچان لیا۔یہ تو اشفاق احمد بہہ روپیہ ہے۔میرے منہہ سے نکل گیا۔

''اشفاق بھائی......''

وہ چونکا اور آنکھیں تریر کر کہا_______

''کیا کہا......کون اشفاق بھائی۔میرا نام مہندر یادو ہے اور میں ڈھپری پارٹی کا اُمیدوار ہوں۔اس بار اس شہر سے مجھے ٹکٹ ملا ہے اور میں گن کی نوک پر الیکشن جیت کر دیکھاؤں گا چلو ساتھیوں''_______ اسکا یہ تیور دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔اسکے اس روپ پر میں اسے مبارکباد دینا چاہتا تھا مگر وہ آگے بڑھ گیا۔میں نے سوچا تھا آگے جا کر پلٹے گا اور مسکرا کر کہے گا_______ ''میں اشفاق احمد بہہ روپیہ۔معاف کیجئے گا۔کیسی رہی میری اداکاری''_______ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ پلٹا نہیں بلکہ آگے بڑھ گیا۔میں بھی اُسکے پیچھے ہو لیا۔ابھی وہ دوسرے چورا ہے کی طرف مڑنے ہی والا تھا کہ ایک آٹو والے نے بالکل اسکے قریب جا کر بریک لگایا۔بہہ روپیہ بگڑ گیا' کالر پکڑ کر آٹو والے کو کھینچ کر آٹو سے باہر نکالا اور ایک طمانچہ مارا_______

''سالہ ٹیمپو چلا رہا ہے یا ہوائی جہاز' نہیں سوجھتا کہ نیتا جی جا رہے ہیں۔''_______ اسکا تیور ایک غنڈے جیسا تھا۔

آٹو والا اپنا گال سہلاتا ہوا آٹو میں بیٹھا۔ آٹو اسٹارٹ کیا اور دھیرے سے آگے بڑھا دیا۔ نیتا جی آگے بڑھ گئے۔

میں حیران تھا کہ آج یہ اشفاق احمد بہہ روپیہ کو کیا ہوگیا ہے وہ کسی سے نہیں کہہ رہا تھا کہ وہ بہہ روپیہ ہے۔ نہ ہی کسی کا روپیہ واپس کر رہا تھا۔ بلکہ سارا روپیہ اپنی جیب میں ڈالتا جارہا تھا البتہ رہ رہ کر نقلی موبائیل سے نمبر ملاتا اور کہتا ______

''ہیلو میں ستہ دھاری پارٹی کا اُمیدوار مہندر یادو بول رہا ہوں۔ بھئی پورا شہر میری جے جے کار کر رہا ہے۔ بس میری ہی ہوا بہہ رہی ہے سمجھ لیجئے کے الیکشن جیت گئے۔ کیا کہا...... مقابلہ...... میرا مقابلہ کسی سے نہیں ہے پچاس ہزار سے بھی زیادہ ووٹوں سے جیتوں گا......

ہاں...... ہاں سارا انتظام کر دیا ہے کل ٹٹیسر گاؤں میں ہریجنوں کو دو دو سو روپیہ بانٹ دیا ہے اور شراب کی بوتل بھی...... مسلمان...... ارے ان کو اجمیر زیارت کے لئے مفت میں بس سے بھیجوانے کا انتظام کر دیا ہے...... سب ووٹ میرا ہے۔ مکھیہ منتری تو آپ ہی بنیں گے۔ مجھے ہر حال میں کیبنیٹ منتری کا پد چاہئے'' ______ میں پریشان ہو اُٹھا یہ اشفاق احمد کیا بک رہا ہے اس کا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے۔ ابھی میں مزید سوچ پاتا کہ دیکھا وہ ایک آدمی کو پکڑ کر بُری طرح پیٹ رہا ہے۔ اسکے باڑی گارڈ اور کارندے بھی اسے پیٹ رہے ہیں۔ وہ آدمی بُری طرح زخمی ہوگیا ہے۔ جگہ جگہ سے خون بہہ رہے ہیں۔ تبھی وہاں پولس آجاتی ہے اور اشفاق احمد کو گرفتار کر لیتی ہے۔ پولس کو دیکھ کر اُس کے کارندے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں پولس پکڑ کر اُسے تھانے لے آتی ہے جب اُس کی پٹائی ہونے لگتی ہے تو اسکا ہوش بحال ہوتا ہے۔

''مجھے مت مارو...... مجھے مت مارو...... میں اشفاق احمد بہہ روپیہ ہوں......''

''پھر تم نے لوگوں سے چندہ کی رقم کیوں وصول کی اور لیا تھا تو واپس کیوں نہیں کیا۔ پھر تم نے کئی لوگوں کو بلا وجہہ پیٹ ڈالا اور اُس وکیل کو تو زخمی ہی کر دیا'' ______ انسپکٹر بولا۔

''مائی باپ معاف کر دیں۔ نیتا کا روپ دھارن کرتے ہی نہ جانے مجھے کیا ہوگیا۔ ایسا لگا میرے اندر کسی نیتا کا جنم ہوگیا ہے۔ میں خود سے وہ سب نہیں کر رہا تھا بلکہ میرے اندر پیدا ہونے والا نیتا یہ سب کارنامہ انجام دے رہا تھا۔ مائی باپ مجھے معاف کر دیں۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے''

چونکہ پولس کو فون کر کے میں نے ہی خبر دی تھی اس لئے تھانہ پہنچ گیا۔ انسپکٹر نے مجھے دیکھکر کرسی بڑھا دی۔ وہ مسکرا کر بولا۔

''بیٹھئے پتر کار مہودے۔ آپ نے فون کر کے مجھے خبر کی، بہت اچھا کیا نہیں تو اور نہ جانے کیا کیا انرتھ یہ کرتا۔ اس بہہ روپیہ نے تو کمال ہی کر دیا'' ______

''ہاں میں صبح سے ہی دیکھ رہا تھا۔ یہ نیتا کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے انسپکٹر صاحب کہ اسکی نقل بھی اُتاری جائے تو وہ حقیقت بن جاتی ہے۔''

انسپکٹر مسکرا دیا اور میں اشفاق احمد کو لے کر تھانے سے باہر آگیا۔

''مائی باپ اب میں کبھی بھول کر بھی کسی نیتا کا روپ نہیں دھارن کروں گا ______''

______ میں نے مسکرا کر اسکا کاندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔

••

ٹریٹمنٹ

صدف جب ڈاکٹر آفتاب کے قریب لائی گئی تو اُسے دو تین لوگوں نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔اس نے ڈاکٹر آفتاب کی طرف دیکھکر اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ یوں محسوس ہوا گویا کسی مکان کی ٹین والی چھت پر بہت سے پتھر اچانک گرنے لگے ہوں۔ ذرا دیر بعد قہقہہ لگا کر پہلے کی طرح سنجیدہ ہوگئی پھر ڈاکٹر آفتاب کی طرف قدرے جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولی—— ''ہر مرد کمینہ ہوتا اور آپ اوّل درجے کے کمینے ہیں''۔

ڈاکٹر آفتاب پر کوئی ردّعمل نہیں ہوا کہ وہ اکثر اس طرح کے پاگلوں کی بدزبانیاں سننے کا عادی ہوگیا تھا قبل اس کے کہ وہ کوئی بات کہتا صدف نے پھر سے قہقہہ لگانا شروع کر دیا۔

''اِسے اپنے وارڈ میں لے جاؤ''—— ڈاکٹر آفتاب نے اسکے معصوم خوبصورت سے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وارڈ بوائے صدف کو اسی طرح پکڑے وارڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ ڈاکٹر آفتاب کے چہرے پر شفیق مسکراہٹ رقص کرگئی۔اس نے صدف کی رپورٹ ٹیبل سے اُٹھائی اور پڑھنے میں محو ہوگیا۔

صدف پیار میں چوٹ کھائی ایک لڑکی تھی۔ ساحر نے اُسکے ساتھ بے وفائی کی تھی اور وہ اسکے پیار میں پاگل ہوگئی تھی۔

''ایسے بھی کوئی نظر پھیرتا ہے''—— ڈاکٹر آفتاب نے دل میں سوچا۔

دور سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں صدف کے دامن سے اُلجھتی ہیں۔ وہ بستر پر بیٹھی وارڈ کے در و دیوار کو تک رہی ہے۔اس وارڈ میں دو چار عورتیں اور کم سن لڑکیاں بھی موجود ہیں جو بستر پر بیٹھی یا لیٹی عجیب عجیب حرکتیں کر رہی ہیں۔

صدف، جو پاس بیٹھی ایک لڑکی کو بہت دیر سے گھور رہی تھی اس کی طرف قدرے جھک کر بولی——

''تم ایشوریہ رائے لگتی ہو۔''

اس لڑکی نے پہلے صدف کو دیکھا پھر اپنے بغل والی عورت سے وہی جملہ زور سے دہرایا——

''تم ایشوریہ رائے لگتی ہو۔''

اس عورت نے اپنے بغل والی عورت سے چلاّ کر وہی جملہ ادا کیا۔

اس طرح وارڈ میں ایک شور برپا ہوگیا۔صدف نے زور سے سب کو ڈانٹا—— ''خاموش رہو۔تم سب پاگل ہو؟...... اسے پاگل خانہ سمجھ لیا ہے کیا؟''......اور پھر زور سے قہقہہ لگانا شروع کر دیا......''سب پاگل ہیں......یہ دنیا ہی پاگل خانہ ہے''——

کچھ لمحے کے بعد صدف اپنے بستر پر لوٹ آئی اور خاموش بیٹھ گئی کل وہ اس طرح خاموش بیٹھنے والی لڑکی نہیں تھی بلکہ شوخ، چنچل، ہرنی جیسی قلانچیں بھرنے والی لڑکی تھی۔

یادیں۔۱

شام کی ذراسی بارش بھی کتنی خوش گوار ہوتی ہے۔ساری فضا میں زندگی بکھیر دیتی ہے۔روح میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے۔ صدف نے نظر اُٹھا کر دیکھا درختوں پر ننھے ننھے پتے ہوا کے جھونکوں سے ایک والہانہ رقص میں محو تھے۔کہیں کہیں بارش کے قطرے موتیوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ہوا شاخوں سے سرگوشیوں میں مصروف تھی۔کوئی شریر جھونکا اس کی زلفوں کو چھیڑ جاتا تو وہ آپ ہی آپ شرما جاتی۔وہ بس کے انتظار میں بس اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ اچانک ایک تیز رفتار کار اسکے بالکل پاس سے گزری جو سڑک پر گڑھے میں بھرے گندے پانی کو اُڑاتی ہوئی گزر گئی پانی کے چھینٹے اس کے کپڑے اور چہرے کو جہاں تہاں سے بھگو گئے۔اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''نان سنس......اڈیٹ——''

کار رک گئی۔کار کو بیک کیا اور بالکل صدف کے قریب لاکر کھڑی کر دیا۔شیشے سے منہ باہر نکال کر آہستگی سے کہا——

''آئی ایم سوری''——

صدف نے نظر اُٹھا کر دیکھا ایک خوب رو نوجوان کار میں مسکرا کر معافی مانگ رہا تھا۔پشیمانی اسکے چہرے سے عیاں تھی۔صدف نے غصّے سے چہرے کو دوسری طرف موڑ لیا۔وہ نوجوان کار پھر سے اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھ گیا اور صدف ہینکی نکال کر چہرے کو صاف کرنے لگی۔اس نے اپنے بھیگے ہوئے دامن کو دیکھا اور جھاڑنے لگی۔

صدف نے جیسے ہی ڈرائنگ روم میں قدم رکھا ایک نوجوان کو وہاں بیٹھا ہوا پایا اس نے اسے پہچاننے کی کوشش کی کہ شاید یہ وہی لڑکا ہے جس نے کچھ دیر قبل پانی کے چھینٹے سے اسکے کپڑے کو گندا کر دیا تھا جس کے نشانات ابھی بھی اسکے کپڑے پر موجود تھے۔ایک بار پھر اس پر غصہ آیا کہ یہ یہاں کیا کر رہا ہے مگر اس کو نظر انداز کر کے اپنے کمرے کے طرف بڑھنا چاہتی تھی کہ ممّی کی آواز نے اسکے قدم روک دیئے۔

''صدف اِدھر آیئے''

صدف ان کے پاس آ گئی۔

''ان سے ملئے ساحر کریم۔ میری چچا زاد بہن کا لڑکا۔ امریکہ سے منجمنٹ کا کورس مکمل کر کے آیا ہے اور آتے ہی ایک بڑی کمپنی میں ملازم ہو گیا ہے''۔

''آداب!''—— صدف نے بغیر دیکھے ہی سلام کیا ساحر کو بھی اسکا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگا۔ پھر اسکے کپڑے پر چھینٹے کے نشانات دیکھ کر یقین ہو گیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے اس کی کار نے پانی سے بھگو دیا تھا۔ وہ واقعی شرمندہ تھا۔

''بیٹی ساحر کے لئے چائے بنایئے''

صدف ڈرائنگ روم سے نکل کر پہلے اپنے کمرہ میں گئی۔ کپڑے چینج کیے پھر چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔

چائے لے کر صدف ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو کچھ حد تک اس نے خود کو نارمل کر لیا تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ساحر کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا جبکہ ساحر مسلسل اُسے ہی تکے جا رہا تھا۔ مسز کرامت علی نے دونوں کو دیکھا پھر گویا ہوئیں۔

''لو بیٹے چائے پیو''

''جی خالہ جان''—— ساحر نے چائے کی پیالی اُٹھائی۔

''بیٹے ساحر، صدف بی. سی. اے. کا کورس کر رہی ہیں۔ فائنل ائیر ہے۔''

''جی یہ تو خوشی کی بات ہے لیکن ان کے منہ میں زبان بھی ہے یا نہیں؟''—— ساحر نے صدف کو چھیڑا۔

''صدف جب بولنا شروع کرتی ہیں تو راجدھانی اکسپریس بن جاتی ہیں۔ رُکنے کا نام ہی نہیں لیتیں''۔

''لیکن میں تو ابھی تک ان کی شیریں آواز سے محروم ہوں''—— ساحر نے طنزیہ نگاہوں سے دیکھا۔ صدف صرف نظر اُٹھا کر ساحر کو دیکھتی ہے۔

''بیٹے تم لوگ باتیں کرو میں ایک ضروری کام نپٹا کر آتی ہوں''—— مسز کرامت علی صوفے سے اُٹھ کر اپنے کمرہ کی طرف بڑھتی ہیں۔

''صدف میں واقعی بہت شرمندہ ہوں کہ میری کار نے آپ کے کپڑے خراب کر دیئے۔ لیجئے کان پکڑتا ہوں۔ اب تو معاف کر دیجئے۔''—— ساحر نے اپنے دونوں کان پکڑے۔ صدف اسے اس طرح معافی مانگتے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''خالہ جان آپ کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔ واقعی آپ بہت حسین ہیں''—— ساحر نے پہلو بدلا۔ صدف شرما کر نظریں جھکا لیں۔

''آپ تو اس طرح شرما رہی ہیں جیسے کوئی نئی نویلی دلہن''—— صدف کا گال مزید گلابی ہو گیا۔

''آپ کچھ بولیں گی بھی یا میں ہی بولتا رہوں گا''—— ساحر نے جھک کر صدف کو بغور دیکھا۔ صدف نے نظریں اُٹھائیں۔

''میں تو آپ کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتی لیکن امّی اکثر آپ کے بارے میں باتیں کرتی رہتی تھیں۔ ملاقات کا شرف آج

حاصل ہوا ہے۔''——صدف اچانک سنجیدہ ہوگئی اور بات کرنے کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔

''صدف میں کسی تمہید میں یقین نہیں رکھتا اس لئے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے عرض کردوں کہ میں آپکو یہاں دیکھنے کی غرض سے آیا ہوں اور جیسا آپ کے بارے میں سن رکھا تھا اُس سے زیادہ پایا اس لئے آپ سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔آپ کو بھی پورا اختیار ہے کہ اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کرسکتی ہیں۔''

صدف شرما کر بھاگنا چاہتی ہے مگر ساحر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

''اوئی اللہ یہ کیا کررہے ہیں کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا''——صدف نے ہاتھ چھڑانے کی بھرپور کوشش کی مگر گرفت مضبوط ہونے کی وجہ کر نہ چھڑا سکی۔

''للہ ہاتھ چھوڑ دیجئے کوئی دیکھ لیگا تو رسوائی ہوگی۔''

''ایک شرط پر چھوڑوں گا''۔

''کیسی شرط؟''

''آج شام کو ہملوگ ہوٹل ستیم میں مل رہے ہیں۔جلدی بولیے ہاں یا نا۔''

''ہاں!''

ساحر نے ہاتھ چھوڑ دیا اور صدف جلدی سے اپنے کمرہ کی طرف بھاگی۔

یادیں ۔۲

شام ہوتے ہی ہوٹل ستیم میں دھیرے دھیرے لوگ آنے لگے تھے۔رنگین اور قیمتی لباس میں ملبوس' مختلف طرح کی پرفیوم کی خوشبوؤں نے فضا کو معطر بنا دیا تھا خوبصورت مسکراہٹیں بکھر بکھر جاتی ہیں۔کوئی حسین جوڑا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جب دروازے سے داخل ہوتا تو ریسٹورنٹ میں بیٹھے لوگوں کی نگاہیں ان کی جانب اُٹھ جاتیں۔سفید وردیوں میں ملبوس کبوتروں کی طرح دِکھنے والے بیرے ادب کے ساتھ ٹیبل کی طرف بڑھتے مینو گاہک کی طرف بڑھا دیتے۔ریسٹورنٹ میں ایک زندگی سی پھیل رہی ہے۔لوگ باگ باتوں میں مصروف ہیں۔محبت کی باتیں' فراق کی باتیں' غم میں ڈوبی دلدوز باتیں' سیاست کی باتیں' ادب کی باتیں' فلم کی باتیں اور دنیا جہان کی باتیں۔قہقہے، چھیڑ چھاڑ، چمچے اور پلیٹوں کی آوازیں ایک پیارا سا شور ایک دلکش ہنگامہ۔

صدف اور ساحر ایک ٹیبل کے گرد بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں صدف کی آنکھوں میں ایک جادو تھا جس میں ساحر کھوسا گیا تھا۔

''اسی طرح دیکھتے رہیں گے یا کچھ آڈر بھی دیں گے''——صدف نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔شاید بیرا ساحر کی آنکھوں کے اشارے کو سمجھ لیا تھا اس لئے تیزی کے ساتھ آکر مینو بڑھایا اور ادب کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ساحر نے کچھ چیزوں کا آڈر دے دیا۔بیرا چلا گیا۔ساحر نے مسکرا کر صدف کی آنکھوں کی طرف دوبارہ دیکھا——

''تمہاری آنکھوں میں کوئی سوال پوشیدہ ہے؟''

''صحیح پہچانا آپ نے میرے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال گردش کر رہا ہے کہ آپ نے ایک ہی ملاقات میں مجھے پسند کرلیا اور شادی کا فیصلہ بھی کرلیا۔''

''صدف، کسی کو جاننے کے لئے ایک ملاقات کافی ہوتی ہے ورنہ پوری زندگی بھی کم پڑ جاتی ہے۔''

''لیکن آپ نے اتنی جلدی میں فیصلہ لیا ہے کہ مجھے خوف سا ہو رہا ہے۔ کہیں آپ کے والدین اس رشتے کے لئے تیار نہ ہوں''۔

''صدف انڈیا لوٹنے کے بعد جب میں نے نوکری جوائن کی تو ممّی پاپا شادی کے لئے بضد ہوگئے۔ انہوں نے دو Option میرے سامنے رکھا۔ پاپا نے اپنی بہن کی بیٹی غفرانہ کی تجویز رکھی اور ممّی نے تمہارے بارے میں بتایا۔ میں پہلے پھوپھی کے یہاں گیا تھا۔ وہاں پر کئی دن گزارے۔ غفرانہ سے ملاقات کی لیکن وہ مجھے کسی طور پسند نہ آئی مگر جب میں نے تم کو دیکھا۔ تم سے باتیں کی تو پہلی نظر میں ہی میرے دل میں جگہ بنالی۔ میں نے یہ فیصلہ کوئی جلدی میں نہیں کیا ہے بلکہ سوچ سمجھ کر کیا ہے''۔

''لیکن پاپا نے انکار کر دیا تو......''

''پاپا ممّی نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔ شادی مجھے کرنی ہے اس لئے اپنی زندگی کا فیصلہ بھی میں ہی کروں گا۔''

''ساحر میں نے زندگی میں کبھی کسی سے پیار نہیں کیا لیکن آپ نے میرے دل میں محبت کی جوت جلا دی ہے اگر یہ جوت بجھ گئی تو میں پاگل ہوجاؤں گی۔ میں بہت حساس لڑکی ہوں کسی بھی بات کو فوراً فیل کرلیتی ہوں۔ آپ سے یہی گزارش ہے کہ دھوکہ نہیں دیجئے گا ورنہ میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔''

ساحر مسکرا کر صدف کی طرف دیکھتا ہے۔ صدف اُسکی آنکھوں میں جھانکتی ہے۔

''صدف میں زبان سے کوئی وعدہ نہیں کروں گا تم میری آنکھوں میں سچائی پڑھ سکتی ہو''۔

''بس یہی سچائی میں ہمیشہ آپ کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔''——صدف نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے گال کے پاس لے گئی۔ ساحر مسکرا پڑا۔

یادیں۔۳

ساحر کو گئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ صدف کو معلوم ہوا کہ اس نے کنیڈا کی ایک بڑی کمپنی کو جوائن کرلیا ہے۔ صدف بے حد خوش تھی کہ ساحر کی ترقی ہوگئی۔ ساحر کنیڈا سے اکثر و بیشتر فون کرتا یا ای میل بھیجتا۔ صدف بھی اسکا جواب دیتی لیکن دھیرے دھیرے کام میں اس طرح منہمک ہوگیا کہ اُسے فون کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ اس طرح ایک سال کا وقفہ گزر گیا اور ایک دن جب صدف نے اپنے گھر میں قدم رکھا تو ممّی پاپا کو بے حد اُداس بیٹھا پایا۔ وہ لوگ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''مُم کیا بات ہے آپ لوگ اس طرح اُداس کیوں ہیں''——صدف ان کے پاس آگئی۔ مسز کرامت علی نے شادی کا کارڈ صدف کی طرف بڑھا دیا یہ ساحر کی شادی کا کارڈ تھا وہ اپنی پھوپھی زاد بہن سے شادی کر رہا تھا۔

کارڈ پڑھ کر صدف نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھوس لیں۔اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دل رو اُٹھا ——

''خداوندا میرے ساتھ اتنی بڑی زیادتی کیوں ہوئی۔میرا قصور کیا تھا۔میں نے تو ساحر کو ٹوٹ کر چاہا تھا لیکن اس نے بے وفائی کی۔وہ زور زور سے رونے لگی۔روتی ہوئی وہ اپنے کمرہ میں گئی اور تکیہ پر سر رکھ کر بہت دیر تک روتی رہی کب اندھیرا ہوا اُسے پتہ بھی نہیں چلا۔جب کسی ضرورت سے مسز کرامت علی کمرہ میں آئیں تو اُس نے گردن اُٹھا کر دیکھا ماں کا چہرہ بھی پژمردہ تھا۔انہوں نے بیٹی کے چہرہ کو دیکھا۔روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں۔سرخ چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔وہ بیٹی سے نظریں نہیں ملانا چاہتی تھیں مگر صدف دوڑ کر ماں کے پاس آئی اور لپٹ کر رونے لگی۔ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے مگر انہوں نے ضبط کر لیا کہ اگر وہ رو پڑیں تو صدف مزید ٹوٹ کر رونے لگے گی۔انہوں نے صدف کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا ——

''بیٹی جو آپ کے ساتھ ہوا اچھا نہیں ہوا مگر اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول جایئے اور پھر سے ایک نئی زندگی شروع کیجئے۔ساحر جیسے بہت لڑکے آپ کو مل جائیں گے۔''

مسز کرامت علی نے صدف کو خود سے الگ کیا اور کمرہ سے نکل گئیں۔وہ زیادہ دیر تک بیٹی کے قریب رہنا نہیں چاہتی تھیں۔صدف کے آنسوؤں کو دیکھنے کی اب ان میں ہمّت نہیں تھی۔وہ کمرہ سے نکل کر کوری ڈور میں آ گئیں۔سیڑھیوں سے اُترتے وقت ایک لمحہ کے لئے ان کے قدم ڈگمگا گئے لیکن ریلینگ کو پکڑ کر سیڑھی پر بیٹھ گئیں اور آنچل کو منہ پر رکھ کر سسک پڑیں۔

یادیں۔٤

کمرہ تاریک ہو رہا ہے ابھی روشنی نہیں جلائی گئی ہے۔مسز کرامت علی کمرہ میں داخل ہوئیں اور بلب روشن کر دیا۔انہوں نے دیکھا صدف فرش پر بیٹھی ایک ٹک دیوار کی طرف دیکھ رہی ہے جیسے کوئی پتھر کی مورت ہو۔اسکی پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں۔مسز کرامت علی صدف کے قریب آئیں اور اسے ہلکی سی جنبش دیں۔اس نے کوئی حرکت نہیں کی تو انہوں نے زور سے جھنجھوڑا۔صدف نے مسز کرامت علی کی طرف دیکھا پھر اچانک قہقہہ لگانا شروع کر دیا۔قہقہہ کی آواز بلند ہوتی گئی پھر اچانک خاموش ہو گئی۔ماں کی طرف دیکھا۔مسز کرامت علی یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔انہیں خوف محسوس ہوا کیوں کہ صدف ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔اسکی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت تھی جیسے کسی کا خون کر دے گی۔انہوں نے وہیں سے آواز لگائیں ——

''کہاں ہیں سب لوگ، جلدی سے صدف کے کمرہ میں آیئے۔پتہ نہیں صدف کو کیا ہو گیا ہے''

کرامت علی کے ساتھ گھر کے نوکر بھی دوڑ کر صدف کے کمرہ میں آ گئے اور اسکی حرکت دیکھ کر حیران رہ گئے۔کرامت علی نے ڈاکٹر کو فون کیا۔صدف اسی طرح قہقہہ لگائے جا رہی تھی اور گھر کے لوگوں کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد پاگل خانہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔اور آج اُسے پاگل خانہ پہنچا دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب کو صدف کی جب پوری تفصیلات معلوم ہو گئی تو اس نے سوچا —— ''صدف کے دکھوں کا سمندر کتنا گہرا کتنا وسیع

ہے۔''

تبھی وارڈ بوائے نے آ کر ڈاکٹر آفتاب کو اطلاع دی کہ ڈاکٹر ملہوترا نے آپ کو یاد کیا ہے۔

اس نے رپورٹ ٹیبل پر چھوڑ کر ڈاکٹر ملہوترا کے کمرہ میں داخل ہو گیا۔

''جی سر آپ نے یاد کیا؟''

''ہاں تم نے صدف کا کیس پڑھ لیا ہے۔''

''یس سر''

''تو پھر کیا سوچا ہے''

''سر آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں اُسکا ٹریٹمنٹ کروں گا اور مجھے اُمید ہے صدف جلد ٹھیک ہو جائیگی۔

''تو پھر آج سے ہی اسکا ٹریٹمنٹ شروع کر دو''

''یس سر''

''جاؤ گڈ لک''

ڈاکٹر آفتاب کمرہ سے نکل گیا۔

آج کئی گھنٹے کی بارش کے بعد جب سردی پھٹ پڑی تو پتہ نہیں صدف کا قہقہہ کہاں کافور ہو گیا۔ وہ اپنے وارڈ سے نکل کر جیسے ہی باہر قدم نکالنا چاہا وارڈ بوائے نے اسے روک دیا مگر اس نے اشارہ سے لان کی طرف بتایا کہ وہ پھولوں کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہے۔ وارڈ بوائے اُسے راستہ دے دیا مگر دو وارڈ بوائے اسکے پیچھے پیچھے سائے کی طرح لگے رہے۔ وہ بہت دیر تک پھولوں کو دیکھتی رہی اور ایک پھول توڑ کر اپنے جوڑے میں لگا لی پھر وہیں ایک بینچ پر بیٹھ گئی ڈاکٹر آفتاب جو بہت دیر سے اسکی حرکتیں دیکھ رہا تھا اس کے قریب آ گیا۔

''ہیلو مس صدف''——صدف نے ڈاکٹر آفتاب کو دیکھا۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو یہاں بیٹھ جاؤں''——ڈاکٹر آفتاب نے بینچ کے طرف اشارہ کیا صدف کچھ نہیں بولی۔ ڈاکٹر آفتاب پاس ہی بیٹھ گیا۔

''آپکے جوڑے میں یہ پھول بہت اچھا لگ رہا ہے——ڈاکٹر آفتاب نے اسکے جوڑے کی طرف دیکھا۔ صدف کچھ نہیں بولی البتہ اس نے اپنا دایاں ہاتھ جوڑے کے قریب لے گئی کہ پھول سہی جگہ پر ہے یا پھر وہاں سے سرک گیا ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ پھول اپنی جگہ پر موجود ہے تو اسے اطمنان ہوا۔

''آپ اپنے وارڈ سے نکل کر یہاں کب آئیں——ڈاکٹر آفتاب نے باتوں کا سلسلہ آگے بڑھایا اس نے ڈاکٹر آفتاب کو غور سے دیکھا اور دھیرے سے بولی——

''آپ اوّل درجہ کے بے وقوف ہیں۔''

''وہ تو ہوں اس لئے تو آپ کے پاس بیٹھا ہوں تاکہ دو بے وقوف مل کر کچھ باتیں کریں''۔

صدف کچھ نہیں بولی جب ڈاکٹر آفتاب نے محسوس کیا کہ صدف بات کرنا نہیں چاہ رہی ہے تو دھیرے سے اُٹھا——

''اچھا اب چلتا ہوں۔ دوسرے مریضوں کو بھی دیکھنا ہے''——

ڈاکٹر آفتاب اُٹھتا ہے اور وارڈ کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ صدف اُسے جاتے ہوئے دیکھتی ہے اور منہ بنا کر بولتی ہے—— ''احمق کہیں کا''۔

ڈاکٹر آفتاب کا زیادہ تر وقت صدف کے ساتھ گزرتا۔ وہ اُسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ اسکا دل بہلاتا۔ طرح طرح کے قصّے کہانیاں سناتا۔ ہنساتا۔ رفتہ رفتہ صدف آفتاب سے مانوس ہونے لگی لیکن ساحر کی یاد جب اُسے ستاتی وہ خاموش ہو جاتی تب آفتاب بیحد محبت سے سمجھاتا——

''ساحر نہیں ملا تو کیا زندگی رک جائے گی...... نہیں...... قطعی نہیں...... زندگی تو زندگی ہے پھر رواں دواں ہو جائے گی۔ پرندوں کو دیکھو ایک گھروندہ ٹوٹتا ہے تو دوسرا بنا لیتا ہے''۔

آنسوؤں کی گرمی سے رات جاگ اُٹھتی۔ ایک مانوس لمس کا احساس صدف کو بے اختیار کر دیتا۔ نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ آنکھوں میں رمق۔ ایک بت کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ اسکا چہرہ سپید ہو گیا تھا اسکا دل چاہتا کہ وہ خوب زور زور سے روئے لیکن ڈاکٹر آفتاب کی باتیں اسکے کانوں میں بازگشت کرتی رہتیں——

''زندگی کسی کے نہ رہنے سے ختم تو نہیں جائے گی''۔

اب اسکی سوچ کا محور ڈاکٹر آفتاب ہوتا جا رہا تھا——

''کتنا خلوص کتنی محبت ہے ان کی باتوں میں۔ انسان انسان میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ ایک کسی کی زندگی میں اندھیرا بھر دیتا ہے اور دوسرا اُجالے سے منوّر کر دیتا ہے۔ کسی کی بے کیف زندگی میں رنگ بھر دیتا ہے۔

وہ خواب کے آغوش میں جاتے ہوئے محسوس کرتی کے ڈاکٹر آفتاب کی انگلیاں اسکی زلفوں کو سہلا رہی ہیں۔ نیم خوابی کے عالم میں اسکی مترنم آواز اُسے سنائی دیتی——

''ایک گھروندہ ٹوٹ جاتا ہے تو دوسرا بن جاتا ہے''۔

صدف کو اس وقت تسکین ملتی جب وہ ڈاکٹر آفتاب کے پاس ہوتی، اس سے بات کر رہی ہوتی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ڈاکٹر آفتاب کی طرف کھینچتی جا رہی ہے۔ اسکی آنکھوں میں پھر سے چمک نمودار ہونے لگی ہے۔ آس پاس رنگینیاں بکھرنے لگی ہیں۔ قہقہے لگنے لگے ہیں۔ ہر طرف چاندنی کھلی ہے۔ جا بجا گل کھلے دِکھ رہے ہیں۔ بلبلیں، تتلیاں رقص کر رہی ہیں۔ ہوائیں اٹھکیلیاں کر رہی ہیں۔ صدف مسکراتی ہوئی اُٹھی اور لان کی طرف دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔ یہ وقت آفتاب کے آنے کا تھا۔

برف کی طرح اُجلی پوشاک پہنے صدف جب ڈاکٹر ملہوترا کے چیمبر میں آئی تو اسکے چہرے میں رعونت بکھری ہوئی تھی۔ وہاں ڈاکٹر آفتاب پہلے سے موجود تھا۔ صدف نے مسکرا کر اُسے وش کیا۔ آفتاب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ڈاکٹر ملہوترا نے گھڑی دیکھی اور صدف کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ملہوترا اپنے لیٹر پیڈ پر کچھ لکھتے رہے اسی اثنا میں کرامت علی چیمبر میں داخل ہوئے اور سلام کر کے کرسی پر براجمان ہو گئے۔ ڈاکٹر ملہوترا نے کاغذ کرامت علی کے طرف بڑھایا۔

''آپ صدف کو لے جا سکتے ہیں۔ کچھ دوائیاں میں نے لکھ دی ہیں آپ اسے پابندی سے دیتے رہیں لیکن اس بات خاص خیال رہے کہ اسے کوئی دوبارہ شاک نہ لگے ورنہ...... ڈاکٹر ملہوترا کچھ دیر کے لئے رکے — ''آپ اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور تنہا نہ چھوڑیں۔ کچھ احتیاط اس میں لکھ دیا ہے آپ اس پر عمل کریں۔ اب آپ اسے لے جا سکتے ہیں''۔

کرامت علی کرسی سے اُٹھتے ہیں۔ ساتھ میں صدف بھی اُٹھتی ہے دونوں چیمبر سے باہر نکلتے ہیں ڈاکٹر آفتاب ان کے پیچھے آتا ہے تینوں ہاسپٹل کے صدر دروازہ تک آتے ہیں۔

''ڈاکٹر آفتاب آپ کا بہت بڑا احسان ہے کہ میری بیٹی ٹھیک ہو گئی''۔

ڈاکٹر آفتاب مسکرایا— کرامت صاحب ہم ڈاکٹروں کا یہ فرض ہے کہ اپنے مریض کا خیال رکھیں اور اسکا ٹریٹمنٹ ایسا کریں کہ وہ صحت یاب ہو کر اپنے گھر لوٹے۔ اس میں احسان کی کوئی بات نہیں۔

صدف نے آفتاب کی طرف مسکرا کر دیکھا— ''کیا آپ اپنا موبائیل نمبر دینا پسند کرینگے تا کہ کبھی کبھی آپ سے بات کر سکوں''۔

''آف کوس...... یہ رہا میرا وزیٹنگ کارڈ۔ اس میں میرے گھر کا نمبر بھی ہے اور موبائل نمبر بھی''— آفتاب نے جیب سے کارڈ نکال کر صدف کی طرف بڑھایا۔ اس نے فوراً لپک لیا۔ جیسے اسکی منتظر تھی۔

''اچھا ڈاکٹر صاحب اب اجازت دیجئے''۔

کرامت علی نے ہاتھ ملا کر وداع لیا۔ صدف بار بار آفتاب کو دیکھتی جاتی تھی۔ مگر آفتاب اس سے بے خبر اپنے چیمبر کی طرف لوٹ رہا تھا۔

مہربان رات ہر روز صدف کی آنکھوں میں ایک نیا خواب دے جاتی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ ڈاکٹر آفتاب کو دل دے بیٹھے گی۔ اب اُسے ہر لمحہ ہوا کی سرسراہٹ میں آفتاب کی سرگوشیوں کا گمان ہوتا۔ جیسے چپکے سے آ کر اسکے کانوں میں کچھ کہا ہے لیکن جب آنکھ کھول کر دیکھتی تو وہاں کوئی نظر نہیں آتا۔ اس نے کئی بار ڈاکٹر آفتاب کو فون کیا۔ بات بھی کی لیکن اظہارِ محبت نہ کر سکی۔

صدف کے گھر والوں کو رفتہ رفتہ اس بات کا اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ ڈاکٹر آفتاب کو بے حد چاہتی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا پل ہوتا جب وہ ڈاکٹر آفتاب کا ذکر نہ کرتی۔ وہ اس طرح اسکا قصیدہ پڑھتی جیسے آفتاب اسکی زندگی کا ایک حصّہ بن گیا ہے۔ صدف کی بیتابی دیکھ کر مسز کرامت علی نے اپنے شوہر سے کہا—

''صدف کی دلچسپی ڈاکٹر آفتاب میں کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے۔ آپ ڈاکٹر آفتاب سے شادی کی بات کریں مجھے لگتا ہے کہ ان دونوں

کے درمیان میں کچھ تو ہے۔جس کا اظہار دونوں میں سے کوئی نہیں کر پار ہے ہیں۔اگر دونوں کی شادی ہو جاتی تو صدف کے لئے بہتر ہوتا بڑی مشکل سے وہ ساحر کو بھول پائی ہے''۔

''اگر ایسی بات ہے تو میں ڈاکٹر آفتاب سے بات کرتا ہوں''۔۔۔ کرامت علی کے چہرے پر بھی مسرت رینگ گئی۔

دوسرے دن ہی کرامت علی ڈاکٹر آفتاب سے ملنے ہاسپٹل پہنچ گئے۔اس وقت وہ اپنے چیمبر میں تنہا تھا۔کرامت علی کو دیکھ کر سلام کیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کہئے کیسے زحمت کی۔صدف کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا''۔

''صدف تو بالکل ٹھیک ہے میں چاہتا ہوں کی اب اسکی شادی کر دی جائے''۔

''یہ تو بہتر سوچا ہے کوئی لڑکا ہے نظر میں''۔

''صدف نے کسی کو پسند کر رکھا ہے۔اُسے وہ بے حد چاہتی ہے اور اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے''۔

''یہ تو اور اچھی بات ہے پھر دیر کس بات کی ہے۔''

''میں یہ جاننے آیا ہو کہ وہ بھی صدف کو اتنا ہی چاہتا ہے جتنا صدف چاہتی ہے۔''

''کون ہے وہ لڑکا؟''

''اس کا نام ڈاکٹر آفتاب ہے''۔۔۔اپنا نام سن کر وہ چونک پڑتا ہے۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔صدف اور مجھ سے پیار کرتی ہے۔''

''ہاں بیٹے شاید ہی کوئی ایسا پل ہوگا جس میں آپ کو یاد نہ کرتی ہو۔''

''کرامت صاحب میں ایک ڈاکٹر ہوں میرے پاس صدف جیسی نہ جانے کتنی مریضہ آتی ہیں۔اس طرح کی مریضوں کے لئے ہمارا ٹریٹمنٹ یہ ہوتا ہے کہ اسکے دل سے پچھلی ساری باتیں نکال دی جائیں اسکے اندر جینے کی خواہش پیدا کی جائے تا کہ وہ نئی زندگی شروع کر سکے۔یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر مرد بے وفا نہیں ہوتا۔ہر شخص کسی کو پیار میں دھوکہ نہیں دیتا۔اس بات کا وشواس پیدا کرتے ہیں کہ ایک کے چلے جانے سے زندگی کی گاڑی رک نہیں جاتی اس طرح مریض ہماری محبت، ہماری ہمدردی اور ہماری باتوں پر یقین کر کے پچھلی ساری باتیں بھول کر ایک نئی زندگی جینے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور یہیں پر ہمارا ٹریٹمنٹ ختم ہو جاتا ہے''۔

''لیکن صدف کے دل میں آپ کی محبت جاگ اُٹھی ہے اور وہ آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔میں ایک باپ ہونے کے ناطے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ آپ اس سے شادی کر لیں اور اسکی دنیا آباد کر دیں نہیں تو وہ ٹوٹ کر رہ جائے گی۔''

''کرامت صاحب اس طرح کی مریضہ ہمارے پاس ہمیشہ آتی رہتی ہیں اور ہمارے ٹریٹمنٹ سے اچھی ہو کر جاتی ہیں۔لیکن اگر ہم ہر مریضوں سے شادی کرنے لگے تو ایک نہیں سو بیویاں ہو جائیں گی۔آپ کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر اُسکی شادی کر دیجئے مجھے امید ہے وہ تیار ہو جائیگی''۔

ڈاکٹر آفتاب اس موضوع پر زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا وہ کرمت علی کو تنہا چھوڑ کر چیمبر سے نکل گیا۔

زینہ زینہ اترتی شام جب رات کی اوٹ میں سب کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو کرامت علی مضمحل چہرہ لئے گھر میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر انکی بیوی سمجھ گئی کہ وہ مایوس لوٹے ہیں۔ باپ کی آہٹ سن کر صدف دوڑی ہوئی اپنے کمرہ سے نکلی لیکن باپ کا اداس چہرہ دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

''کیا ہوا پاپا؟—وہ جواب سننے کے لئے بے تاب تھی''

کرامت علی خاموش رہے لیکن صدف نے جب بے حد اصرار کیا تو کہا—

''ڈاکٹر آفتاب نے شادی سے انکار کر دیا''

صدف کچھ دیر یونہی خاموش کھڑی رہی۔ سب کے چہرے کو باری باری سے دیکھا۔ درودیوار کو دیکھا اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''ہاہاہا..........سب پاگل ہے...... یہ دنیا پاگلوں کی آماجگاہ ہے میں بھی پاگل ہوں۔ تم لوگ بھی پاگل ہو۔ سب پاگل ہیں۔ ہاہاہا..........''

وہ زور زور سے قہقہہ لگا رہی تھی کرامت علی اور مسز کرامت علی اسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ سب کو جھٹک کر دروازے کی طرف بڑھی۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور قہقہہ لگاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

●●

چارہ گر

نفیسہ ابھی تک سوچ کے صحرا میں گم تھی ——— ‘

اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب ندیم آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا جب ندیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو گویا وہ چونک پڑی اور اپنی خوبصورت پلکیں جھپکائیں ——— ‘

’’ آپ کب آئے؟ ‘‘

’’ جب تم نے دیکھا ‘‘ ——— ندیم نے نفیسہ کو غور سے دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ندیم نے اپنی ہتھیلی آگے بڑھائی۔ نفیسہ نے اپنا چہرہ ندیم کی ہتھیلیوں پر ٹکا دیا۔ چاند ہتھیلیوں کے آسمان پر نکل آیا۔ ندیم نے اسے محویت سے دیکھا۔

’’ کیا دیکھ رہے ہیں؟ ‘‘ ——— نفیسہ مسکرا رہی تھی۔

’’ تم واقعی بہت خوبصورت ہو۔ ایسا لگتا ہے میرے کمرہ میں چاند اتر آیا ہے ‘‘ ——— نفیسہ کی خوبصورت آنکھوں میں ندیم کا چہرہ کھب گیا۔

’’ آپ کی دیوانگی شادی کے سات سال کے بعد بھی کم نہیں ہوئی ہے ‘‘ ——— نفیسہ بظاہر ہنستے ہوئے بولی:

’’ کیا کروں یہ تمہارے حسن کے کرامات ہیں ‘‘ ——— ندیم اس کی ہستی کو غور سے دیکھے جاتا۔

’’ بس بس زیادہ تعریف نہ کیجئے ‘‘ ——— وہ اُٹھ کر جانے لگی تو ندیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

’’ کیا کر رہے ہیں کوئی آ جائے گا ‘‘ ——— ندیم نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ مسکراتی ہوئی کمرہ سے نکل گئی۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ رات قدم رکھ چکی تھی۔ نہ جانے کیوں رات آتے ہی نفیسہ گھبرا جاتی۔ اسے آنے والے وقت سے ڈر سا لگنے لگتا۔ ندیم اس کے بغل میں سویا تھا مگر ایسا لگتا جیسے وہ اس کے پاس رہ کر بھی اکیلی ہے، بالکل تنہا ——— نفیسہ نے سوچا ——— اس کے سامنے سے کتنے برس گزرتے جا رہے ہیں۔ ایک لمبی اجاڑ بن بادل اور پیاس سے بھری زندگی۔ پانی تلاشتی ہوا میں وہ بہت دور نکل جاتی ہے مگر اسے ہر طرف صحرا ہی نظر آتا ہے۔ اڑتے بگولوں کے سوا اور کیا ہے ——— ؟

وہ سوچتی ـــــــ بارش کا ایک قطرہ سیپ کے اندر موتی پیدا کر دیتا ہے ـــــــ مگر وہ؟ ـــــــ

رات کا پہلا پہر بھیگ چکا تھا مگر وہ جاگ رہی تھی نہ جانے نفیسہ نے کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹی تھیں اور دن کی تپتی دھوپ میں وقت گزارا تھا۔ بظاہر وہ خوش رہنے کی کوشش کرتی لیکن ایک کسک تھی جو اسے ہمیشہ تڑپائے رہتی۔ شادی کے سات سال کے بعد بھی وہ بچے سے محروم تھی۔

نفیسہ گھبرائی سی رہتی۔ اسے دل کے پاس ایک چبھن سی محسوس ہوتی۔ اس کی آنکھیں آسمان سے ہٹ کر زمین پر مرکوز ہو جاتیں ـــــــ یہ زمین کتنی چیزیں پیدا کرتی ہے۔ اناج سے لے کر کوئلہ، پتھر، سونا اور لوہا بھی۔ مگر اس کی زمین جیسے بنجر ہو گئی تھی یا وہ برسات ہی نہیں آئی جو کوئی انکور اُگا سکے ـــــــ؟

کبھی کبھی نفیسہ نڈھال پلنگ پر گر کر سسکنے لگتی۔ اس کا اپنا وجود اس پر ہی مسلط ہو جاتا مگر قصور اس کا نہیں تھا اور نہ ہی کمی ندیم میں تھی، پھر الزام کس پر دھرا جائے؟ ـــــــ خدا تو بڑا کارساز ہے ـــــــ وہ روتے روتے ہلکان ہو جاتی مگر اس کا درد کون سمجھتا ـــــــ ندیم اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتا مگر نفیسہ جب ماں کا چہرہ دیکھتی تو گویا کانپ سی جاتی۔ زبان سے نہ کہتے ہوئے بھی آنکھوں سے اور چہرے سے بہت کچھ کہہ جاتی۔

''مجھے تو خاندان کی فکر ہے۔ ایسا لگتا ہے اب خاندان کا یہیں پر خاتمہ ہو جائے گا۔ گھر میں کوئی چراغ جلانے والا بھی نہ ہوگا' کوئی فاتحہ بھی نہ پڑھے گا۔'' ـــــــ

نہ جانے کتنی باتیں' شکایتیں اور طعنے امّاں کے چہرے سے عیاں تھے مگر بیٹے کی وجہ سے زبان گنگ ہو گئی تھی۔ نفیسہ بخوبی سمجھتی تھی کہ امّاں اندر اندر پک رہی ہیں اور یہ لاوا کسی دن بھی جوالا مکھی سے باہر آ سکتا ہے پھر شاید ندیم بھی اس سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ پائے اور امّاں کے کہنے پر کوئی ایسا قدم اُٹھا لے جو اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر دے ـــــــ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ندیم ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ اُسے بے پناہ چاہتا ہے۔ جنون کی حد تک محبت کرتا ہے۔

نفیسہ نے مشہور ڈاکٹروں سے بار بار رجوع کیا۔ تعویز اور منّت کا سہارا لیا لیکن مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ ندیم نے بھی اپنا چک اپ کرانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھا پھر بھی دامن اس کا خالی ہی رہا۔

نفیسہ ہر پل اس حسین لمحہ کا انتظار کرتی جب اس کی امید بر آئے اور وہ خوشی سے پھولی نہ سمائے۔ لیکن جیسے خوشی اس سے روٹھ گئی تھی ـــــــ' ماں چاہتی تھی جلد از جلد یہ گھر بچے کی کلکاریوں سے گونج اُٹھے۔ دو ننھے ننھے ہاتھ اس کی طرف بڑھیں۔ لڑکھڑاتے قدموں سے کوئی اس کی جانب قدم بڑھائے اور وہ دوڑ کر اسے گلے لگا لے۔ اسے خوب چومے اور سارا پیار اس پر نچھاور کر دے اس کے لیے۔ اس نے ہر جتن کئے۔ دوا سے لے کر دعا تک اور اب مزاروں کی بھی خاک چھاننی شروع کر دی تھی۔ شاید کسی آستانے سے اس کا گھر روشن ہو جائے۔

شہر میں اُن دنوں شاہ سلمان شرف الدین کا کافی شہرہ تھا۔ دور دور تک ان کے مُرید تھے۔ ایک زمانے میں ندیم کی ماں بھی اُن سے مرید ہو چکی تھی۔ اُس وقت ندیم کے والد حیات تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھ عائشہ کو بھی مرید کروایا لیکن پھر کبھی ان کے پاس جانے کا اتفاق نہ ہوا

——— آج اچانک عائشہ کوان کی یاد آ گئی اور وہ پیر صاحب کے آستانے پر پہنچ گئی۔ اُس نے اپنا تعارف کرایا تو پیر صاحب فوراً پہچان گئے اور جب گھر کی خیریت دریافت کی تو عائشہ روہانسی ہو کر بولی ———

''میری تو قسمت ہی چھوٹی ہے۔ میرا گھر بچوں کی کلکاریوں سے نا آشنا ہے۔ میرے بیٹے کی شادی کو سات سال ہو گئے لیکن اولاد سے محروم ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر کو بھی دکھایا۔ دونوں میں کوئی کمی نہیں ہے پھر بھی نہ جانے خدا کی کیا مصلحت ہے۔''

پیر صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر گویا ہوئے ———

''ایسا کرو تم پیر کے دن اپنی بہو کو دوپہر میں لے کر میرے پاس آؤ۔ میں دیکھتا ہوں، شاید کوئی حل نکل آئے۔''

عائشہ خوشی خوشی گھر لوٹی۔ بیٹے اور بہو کو ساری باتیں بتائیں۔ ندیم نے بھی حامی بھر دی کہ وہ یہ بھی کر کے دیکھ لیں تاکہ اُن کو اطمینان ہو جائے ——— نفیسہ نے پیر صاحب کی اتنی تعریف سنی کہ دل ہی دل میں عقیدت پیدا ہو گئی۔ اولاد کی دیرینہ خواہش نے اُس کی عقیدت میں مزید اضافہ کر دیا۔

پیر کے دن عائشہ نفیسہ کو لے کر گھر سے نکلی۔ ندیم دفتر جا چکا تھا۔ آج نفیسہ نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی اور بلاؤز زیب تن کیا تھا۔ گیسو کو سنوارا تھا اور ہلکا سا میک اَپ بھی کیا تھا جو اُس کا معمول تھا۔ جب عائشہ اُسے لے کر پیر صاحب کے پاس پہنچی اُس وقت وہاں کوئی مرید موجود نہ تھا۔ ویسے بھی اکثر دوپہر میں لوگ نہیں آتے تھے۔ پیر صاحب سے ملنے کا وقت فجر کی نماز کے بعد اور عصر کی نماز کے بعد کا ہی ہوتا تھا۔

پیر صاحب بیٹھے ورد میں محو تھے۔ دونوں نے جا کر سلام کیا۔ پیر صاحب نے آنکھیں کھول کر دونوں کو دیکھا۔ اُن کی نگاہیں نفیسہ پر مرکوز ہو گئیں۔ کچھ دیر وہ اُسے بغور دیکھتے رہے، نفیسہ نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ کچھ دیر تسبیح پڑھتے رہے اور اُسے دیکھتے رہے، پھر دعا کی۔ ایک کاغذ نکالا اور قلم سنبھالا ———

''کیا نام ہے؟''

''نفیسہ۔''

''شوہر کا نام؟''

''ندیم'' ——— اس بار عائشہ بولی۔

''اور والد کا نام؟''

''جی عبدالشکور'' ——— نفیسہ نے آہستہ سے کہا۔

''اور والدہ کا؟''

''ہاجرہ۔''

''شادی کس تاریخ کو ہوئی تھی، کچھ یاد ہے؟''

''۲۴ رنومبر ۱۹۹۴ء۔''

تمام تفصیلات لکھ کر حساب کتاب ملاتے رہے، جوڑ گھٹاؤ کیا۔ دونوں پیر صاحب کو دیکھتی رہیں، پھر کچھ سوچ کر پیر صاحب عائشہ سے مخاطب ہوئے ــــــ

''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو تنہائی میں اس سے مزید معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں۔''

''پیر صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم سب تو آپ کے خادم ہیں۔ آپ کہیں بھی لے جائیں، میں یہیں بیٹھتی ہوں۔'' ــــــ عائشہ نے عقیدت کا اظہار کیا۔

پیر صاحب اُٹھے اور نفیسہ کو اشارے سے اندر چلنے کو کہا۔ نفیسہ پل بھر کے لیے جھجکی، اُس نے ساس کی طرف دیکھا اور اُس کا اشارہ پا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسری طرف پیر صاحب کا حجرہ تھا۔ جب دونوں حجرے میں داخل ہوئے تو پیر صاحب نے دروازہ بند کر لیا۔ دروازہ بند کرنے پر نفیسہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اکیلے کمرہ میں ایک غیر مرد کے ساتھ، وہ پسینہ پسینہ ہو گئی مگر اُسے اطمینان بھی ہو گیا کہ وہ پیر صاحب کے ساتھ ہے اور باہر ساس بھی بیٹھی ہے اور یہ سب اُسی کے کہنے کے مطابق ہو رہا ہے۔

''سامنے پلنگ پر بیٹھ جاؤ'' ــــــ یہ کہہ کر انھوں نے شلف سے ایک کتاب نکالی۔ ورق گردانی کی، پھر نفیسہ کو دیکھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ادھر اُدھر نظریں گھما رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پیر صاحب کیا کریں گے۔ پیر صاحب جو رقعہ ساتھ لائے تھے اُس پر نگاہ ڈالی، کتاب کو شلف میں واپس رکھا۔ کاغذ کو دیکھتے ہوئے وہ نفیسہ کے بالکل پاس آ کر بیٹھ گئے۔ نفیسہ نے چاہا کہ وہ الگ ہٹ جائے مگر ہمت جواب دے چکی تھی۔ پتہ نہیں پیر صاحب بُرا مان جائیں اور......

''نفیسہ! تمہیں اولاد چاہئے'' ــــــ پیر صاحب نے نفیسہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ نفیسہ کا گلا خشک ہو گیا تھا، کوئی آواز نہ نکلی۔ اُس نے آہستہ سے صرف سر ہلا دیا ــــــ

''ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد بتایا کہ تم دونوں میں کوئی خرابی نہیں ہے؟'' ــــــ

نفیسہ اس بار بھی بہ مشکل سر ہلا سکی ــــــ!

''پھر تو تمہیں میری پناہ میں آنا ہوگا!''

نفیسہ نے سر اُٹھا کر پیر صاحب کو دیکھا۔ جملہ اُس کی سمجھ سے باہر تھا۔

''میری آنکھوں میں دیکھو'' ــــــ پیر صاحب اور قریب آ گئے۔ نفیسہ نے اُن کی آنکھوں میں جھانکا، آنکھوں میں لال لال ڈورے تیر رہے تھے۔ وہ سہم سی گئی، تبھی پیر صاحب کی آواز اُسے خوف کے اندھیرے کنویں کی طرف دھکیلنے لگی ــــــ

''اگر تم نے اولاد پیدا نہ کی تو تمہاری زندگی اجیرن بن جائے گی۔ تمہاری ساس تمہیں طعنہ دے دے کر تمہیں خودکشی کرنے پر مجبور کر دے گی اور شوہر بھی ایک دن مجبور ہو کر دوسری شادی کر لے گا۔''

''مگر......مگر میں کر کیا سکتی ہوں؟'' نفیسہ کی آواز لرز رہی تھی۔

''تم بچہ پیدا کر سکتی ہو۔''

''کیسے؟''

''میرے قریب آؤ''——نفیسہ جھجکتی ہوئی ذرا سرکتی ہے۔

''اور قریب آؤ......

''......اور قریب......''

نفیسہ پر عقیدت کا خمار تھا یا اولاد کی شدید خواہش جس نے پیروں کی ساری زنجیر ایک جھٹکے سے توڑ دیں۔

باہر عائشہ اُمیدوں کا گلشن سجائے سراپا انتظار تھی کہ پیر صاحب ضرور ایسا عمل کریں گے کہ اس کی بہو اولاد سے محروم نہیں رہے گی——!

کافی دیر کے بعد دونوں باہر آئے۔نفیسہ نے سر پر آنچل ڈال رکھا تھا۔وہ آ کر ساس کے بغل میں بیٹھ گئی۔

''پیر صاحب میری بہو ماں بنے گی نا؟''——عائشہ نے بے قراری سے پوچھا۔

''میں نے تو علاج کر دیا ہے،اگر خدا نے چاہا تو جلد ہی ماں بن جائے گی لیکن اس کے لئے ایک دو دفعہ نفیسہ کو مزید آنا پڑے گا۔''

''کیوں نہیں،آپ کہیں گے تو یہ ضرور آئے گی۔آپ سے ایک اُمید بندھی ہے اور اگر یہ ماں بن گئی تو میں ہمیشہ آپ کی شکر گذار رہوں گی۔''

''نفیسہ میں نے جیسا تم سے کہا ہے ویسا ہی کرنا۔اگر کوئی پریشانی ہو تو پھر چلی آنا۔میرا دل کہتا ہے تم ضرور ماں بنو گی۔''

نفیسہ نے سر اُٹھا کر پیر صاحب کو صرف دیکھا اور دوبارہ سر جھکا لیا۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو''——عائشہ بے حد خوش تھی،وہ بہو کو لے کر گھر کی طرف چل پڑی۔

گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نفیسہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹی موٹی بوندیں چھلک پڑیں،جنہیں جلدی سے اُس نے اپنے آنچل میں جذب کر لیا۔پتہ نہیں یہ آنسو عقیدت کے تھے یا......۔

●●

خواب خواب زندگی

افضل خوش رہنے کی ضرور کوشش کرتا لیکن خوشی جیسے اُس سے روٹھ گئی ہو۔ وہ کل کے مقابلے میں آج سوچنے بہت لگا ہے۔ کیا سوچتا رہتا ہے؟— اس کا مفہوم خود اس پر واضح نہیں۔ سوالات اُس کے ذہن میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور وہ خاموشی سے پلنگ پر لیٹا رہتا ہے۔ اُسے بظاہر کمی بھی کسی چیز کی نہیں ہے۔ خوبصورت پیار کرنے والی بیوی ہے، پانچ ہزار کی نوکری ہے۔ گاؤں میں لوگ اس سے خوش ہیں، سسرال بھی چاہنے والا ملا ہے اور یہاں دہلی میں پرخلوص دوست اور یہ آرام دہ فلیٹ مگر...

کل تک وہ خواب کی آسودہ وخوش رنگ راہوں پر دیر تک آنکھیں بند کئے سفر کرتا رہا ہے اور جیسے وہ یہ بھول گیا تھا کہ سفر آخر سفر ہوتا ہے۔ ایک نہ ایک دن اُسے ختم ہونا ہے اور دھیرے دھیرے سارے مناظر کو بے حس ہو جانا ہے۔ حسرتوں کی بے شمار دنیائیں اکیلے ساتھ لیے وہ بے ارادہ کتنی ہی رات آوارہ سا پھرتا رہا ہے—'

کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کاش اس کی تنخواہ پندرہ ہزار روپے ہو جاتی تو پھر سارے مسائل چٹکی بجاتے حل ہو گئے ہوتے لیکن دور دور تک ایسے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ دوسری نوکری حاصل کرنا محال تھا اور جس نوکری پر افضل مامور تھا وہاں تنخواہ میں خاطر خواہ اضافے کی گنجائش نظر نہیں آرہی تھی۔ اُس نے اپنے ایک عزیز دوست سے سنجیدگی سے پوچھا—

''سچ بتاؤ کیا تم محسوس کرتے ہو کہ میں برباد ہونے والا ہوں؟''

دوست مسکرایا۔ اس نے افضل کے پریشان کن چہرے کو پڑھا اور آہستہ سے کہا—

''افضل آنے والی بربادی کے ذمہ دار مگر صرف تم اور صرف تم خود ہوگے۔''

''میں؟... کیسے؟''

''کیوں کہ جس فریب کی بنیاد پر تم نے اپنی ازدواجی زندگی کی نیو رکھی ہے اُسے ایک نہ ایک دن مسمار تو ہونا ہی ہے''— افضل کا دوست اس کے اندر تک پہنچ گیا۔

''نہیں... میں نے وہی کیا جو میں کر سکتا تھا۔''

''لیکن کامیاب نہیں ہوئے—''

''میں نے کوشش بہت کی!''

''لیکن کوئی حاصل نہیں۔''

''پر میں نے ہار نہیں مانی ہے۔''

''تمہاری یہ پریشانی اور بے چینی تمہاری شکست کی چغلی کھارہی ہے۔''

''میں پریشان کہاں ہوں۔ یہ تو تھکان کا اثر ہے۔''

''تم اندر سے پریشان ہو افضل۔ حقیقت سے نظر چرانا چھوڑ دو، سچ کا سامنا کرو۔ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔''

''اب میں اتنی دور نکل گیا ہوں کہ واپس لوٹنا مشکل ہے۔''

''تو گھٹ گھٹ کر مرتے رہو۔ یہی تمہارا مقدر ہے—''

افضل کا دوست جھنجھلا کر اٹھتا ہے اور کمرہ سے باہر چلا جاتا ہے۔

افضل نے محسوس کیا کہ زندگی کو زیادہ شدّت سے پکڑنے کی کوشش میں خوشی اور اطمینان کی ڈور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔ کیا اس کی بیوی غوثیہ اس سے پیار نہیں کرتی؟ کیا اُس کے درد اور پریشانی کو وہ نہیں سمجھ پا رہی ہے؟ یا جان بوجھ کر وہ انجان بنی افضل کو الجھن میں ڈالتی چلی جا رہی ہے—؟

غوثیہ آسودہ حال گھر میں پلی بڑھی تھی اس لیے شوخی اور فضول خرچی اس کی عادت میں شامل تھی۔ باپ کے گھر میں کسی چیز کی کمی بھی نہیں تھی۔ جو مانگا ملا۔ جس چیز کی خواہش کی اس کی تکمیل ہوئی۔ لیکن افضل...؟

افضل گاؤں کا رہنے والا ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ جب وہ اپنے گاؤں کو خیر باد کہہ کر دلی کے لیے روانہ ہوا تھا تو اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے، اندیشے اُبھر رہے تھے کہ پتہ نہیں کتنے دنوں تک بھٹکنا پڑے گا۔ لاج میں رہنا پڑے گا اور ہوٹل میں کھانا پڑے گا۔ دلی کی مصروف ترین زندگی میں وہ ایڈجسٹ کر پائے گا یا اُسے پھر واپس آنا پڑے گا۔ اگر واپس لوٹا تو کتنی سبکی کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن جب چند مہینوں کی تگ و دو کے بعد ہی اُسے کمپیوٹر آپریٹر کی نوکری ایک پرائیوٹ کمپنی میں مل گئی اور وہ پانچ ہزار روپے کا ملازم ہو گیا تو اب وہ اترانے لگا۔

افضل جب گاؤں جاتا تو گاؤں والوں کے درمیان دھونس جماتا کہ وہ بہت بڑی کمپنی میں کمپیوٹر انجینئر ہو گیا ہے اور اس کی تنخواہ پندرہ ہزار روپے ہے۔ گاؤں کے بھولے بھالے لوگ اس کی بات پر اعتماد کر لیتے۔

انجینئر ہونے کی یہ خبر آس پاس کے گاؤں تک بھی پھیل گئی اور پاس کے ہی گاؤں کے ایک، بہت خوش حال شخص رشید حسن نے اپنی پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی غوثیہ کی شادی افضل سے کر دی۔

غوثیہ نے بارہا دلی رہنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر افضل ٹالتا رہا اور خوش رکھنے کے لیے اُس کی ہر فرمائش پوری کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ فرمائش کی

فہرست لمبی ہوتی گئی۔افضل کی جیب تنگ تھی۔اُسے قرض لینے کی نوبت آگئی مگر غوثیہ کی فرمائش کا سلسلہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا—‘
افضل کا دوست اُسے سمجھاتا ہے—

’’افضل! تم اپنی بیوی پہ واضح کر دو کہ تمہاری تنخواہ پندرہ ہزار نہیں صرف پانچ ہزار ہے۔‘‘

’’تم کیسی باتیں کرتے ہو؟— غوثیہ کی نظروں میں میری کیا عزت رہ جائے گی؟‘‘

’’افضل حقیقت کو ایک دن تو سامنے آنا ہی ہے۔تم صاف صاف بتادو کہ تم انجینئر نہیں کمپیوٹر آپریٹر ہو۔‘‘

’’میں ایسا نہیں کر سکتا۔اس طرح تو گاؤں والوں کو بھی میری حیثیت کا علم ہو جائے گا۔سسرال میں تو میری ناک ہی کٹ جائے گی۔‘‘

’’عزت اور وقار مکر وفریب کے سہارے قائم نہیں رہتا۔دوستوں سے قرض لے کر پندرہ ہزار کی تنخواہ کا جو فریب دے رہے ہو وہ ایک دن تمہیں کہیں کا نہیں رکھے گا۔‘‘

’’میرے دوست! تم ایک ایک لفظ صحیح کہہ رہے ہو مگر میں اب اس فریب کے جال سے نکل نہیں سکتا۔کیونکہ اس فریب سے باہر آ کر میری جو رسوائی ہوگی وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔‘‘

’’اصل سراسیمگی تو اس وقت ہوگی مائی ڈیر! جب سب کو اچانک تمہاری حقیقت کا پتہ چلے گا۔‘‘

’’اس وقت دیکھا جائے گا۔‘‘

’’لیکن تم جس قدر مقروض ہو چکے ہو اس سے تمہاری زندگی میں مزید مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔‘‘

’’تو میں کیا کروں؟‘‘

’’سچ کو سب پر واضح کر دو۔‘‘

’’نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔‘‘

’’تو جاؤ مرو، کوئی کیا کر سکتا ہے‘‘—دوست غصّے میں باہر چلا جاتا ہے‘
افضل دیر تک بے بسی کے عالم میں کمرہ کی ایک ایک چیز کو تکتا رہتا ہے۔اس کی آنکھیں بار بار پھیل جاتیں اور کان میں دوست کی آواز بازگشت کرتی۔اچانک اُسے احساس ہوتا کہ غوثیہ کو سب کچھ معلوم ہو گیا اور وہ نفرت سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ اضطراب کے عالم میں کمرہ میں ٹہلنے لگا— ’’اب کیا ہوگا؟‘‘—یہ کیسی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔بہت دیر بعد اس نے اپنے حواس پر قابو پایا—یہ سب محض وہم ہے۔جب تک وہ نہ بتائے گا غوثیہ کو کیسے پتہ چلے گا کیونکہ وہ تو گاؤں میں رہتی ہے۔
اس دن کچھ عجیب بات ہوئی۔افضل کے کئی دوستوں نے اچانک اُسے گھیرے میں لے لیا۔یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اچھی خاصی رقم افضل کو بطور قرض دے رکھی تھی اور آج سبھی نے مل کر دھاوا بولا تھا کہ اُن کا قرض افضل جلد سے جلد ادا کر دے۔ابھی افضل نے صفائی میں اپنی زبان بھی نہیں کھولی تھی کہ سامنے دروازہ پر اسے غوثیہ کھڑی نظر آئی۔وہ اُسے دیکھ کر ہکا بکّا رہ گیا۔غوثیہ اور دلّی؟—اور وہ بھی بغیر کسی اطلاع کے—افضل چکرا سا گیا۔پھر وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا—

''غوثیہ تم—؟ گاؤں میں سب خیریت تو ہے؟''
افضل کے دوستوں نے بھی گھوم کر دروازہ کی طرف دیکھا۔انہیں بھی بہت حیرت ہوئی۔ غوثیہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اوراس نے اپنے ہاتھ میں لٹکائے بریف کیس کوایک طرف رکھ کرافضل کے دوستوں کوآداب کہااورافضل کے پاس جاکرکھڑی ہوگئی۔دوستوں نے حالات کی نزاکت کااحساس کرتے ہوئے ان دونوں کوکمرہ میں تنہا چھوڑ دیااور باہرنکل گئے—'
کمرہ کادروازہ بندکرکےافضل بجھےقدموں سے واپس آیاتوغوثیہ ایک کرسی پربیٹھی آنچل سے چہرے پرہوادے رہی تھی—
''اُف بہت تھک گئی ہوں۔کیاایک گلاس سادہ پانی بھی آپ کےفلیٹ میں نہیں ہے؟''
''غوثیہ تم اچانک یوں—؟''
''ہاں سوچا آپ کوسرپرائز دوں گی کہ گاؤں میں رہنے والی لڑکی دلی بھی آسکتی ہے۔''
''لیکن اکیلے؟''
''اکیلےنہیں آئی ہوں۔اپنے بھائی عادل کے ہمراہ آئی ہوں۔وہ اپنی بیوی کولے کرآرہاتھاتومیں بھی اُس کےساتھ آگئی۔وہ لوگ لکشمی نگر میں اپنی خالہ کے یہاں اُترگئے... آپ بتایئے کیسے ہیں؟''
''ٹھیک ہی ہوں'—افضل کادل کراہ رہاتھا۔
''خاک ٹھیک ہیں۔دنیابھرکاقرض لے رکھاہے۔سب بیٹھےتقاضہ کررہے تھے۔غلطی میری بھی ہے۔خیرجوہواسوہوا۔میں نے اب فیصلہ کیاہے کہ آپ کےساتھ ہی رہوں گی اورآپ کی موجودہ آمدنی سے ہی ساراقرض اداکروں گی اوراگرآپ اجازت دیں گےتومیں بھی کوئی جوب(Job) ڈھونڈلوں گی۔دونوں مل کرایک نئی زندگی کاآغازکریں گے۔ٹھیک ہےنا؟''
''غوثیہ تمہارایہ رویہ... میں نے خواب میں بھی نہیں سوچاتھا۔''
''آپ نے خواب دیکھ دیکھ کرہی توالجھنیں بڑھالی ہیں۔آج سے خواب دیکھنابند۔اب زندگی کی کتاب کوآپ پڑھئے گاتومیں سنوں گی۔ میں پڑھوں گی توآپ سنئے گا۔''
غوثیہ کی بات سن کرافضل کےلبوں پرمسکراہٹ رینگ گئی اوروہ پانی لینے کے لیے کچن میں داخل ہوگیا۔

●●

اور زنجیر ٹوٹ گئی

جب شام نے اپنے چہرے پر سیاہی کے سایے گھنے کر لیے اور دھیرے دھیرے اس کا سارا بدن سیاہی کے اثر سے اندھیرے کا دیوتا بن گیا تو لوگوں نے اسے رات کا نام دے دیا۔ رات! ـــــ جس میں گناہ صغیرہ سے لے کر گناہ کبیرہ تک کی داستانیں اطمینان سے چہل قدمی کرتی ہیں اور صبح ہوتے ہی نئے میک اپ میں پاکدامنی کی قسمیں کھاتے ہیں ـــــ رات شاید گناہ کے لیے ہی بنائی گئی ہے اور ازل سے انسان اس کا بھرپور فائدہ اُٹھا رہا ہے ـــــ '

ایسی ہی ایک سیاہ رات میں اسلم دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو رہا ہے۔ بغل میں اس کی بیوی عشرت کروٹیں بدل رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں رات شیشے کے ٹکڑے کی طرح چبھ رہی ہے۔ وہ لیٹے لیٹے کمرہ کی تاریکی اور روشنی کے اتصال کا بغور جائزہ لیتی ہے۔

اندھیرے ـــــ جو نائٹ بلب کی مدھم لال روشنی کو اپنی خونخوار زبان سے چاٹنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ کمرہ کے باہر ہُو کا عالم ہے۔ کالے کالے بادل اونچی اونچی عمارتوں پر جھکے ہوئے ہیں۔ جیسے اب برس ہی پڑیں گے لیکن پتہ نہیں ان بادلوں کو کہاں برسنا ہے جو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور نیچے پیاسی دھرتی اپنی منہ کھولے پانی کی منتظر ہے لیکن ہوا کے دوش پر اُڑنے والے بادلوں کو اس کا احساس کہاں! ـــــ وہ تو بس بھاگے جا رہے ہیں مگر عشرت کے لیے وقت جیسے ٹھہر سا گیا ہے۔ وہ لیٹے لیٹے اکتاہٹ محسوس کرنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بیٹھ کر سوچتی ہے اور پھر اپنے وجود کو کرسی پر گرا دیتی ہے۔ اس کی انگلی ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کر دیتی ہے۔ ٹیبل لیمپ کا منہ روشنی اگلنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر شلف سے ایک ناول نکالتی ہے اور اس کے سفید اوراق کو اپنے ہاتھوں کے لمس سے سسکیاں بھرنے پر مجبور کر دیتی ہے پھر اپنی نظریں اس کے چاندی جیسے بدن پر پیوست کر دیتی ہے۔ اس کی نظریں تو کتاب پر ہیں مگر ذہن کہیں اور پرواز کر رہا ہے۔ رہ رہ کر اس کی نظروں کے سامنے اسلم کا وجود آ جاتا ہے اور وہ مزید الجھ کر رہ جاتی ہے۔

اسلم ـــــ اُس کا شوہر۔

اس کا نام آتے ہی ایک ناگوار احساس سے اس کا وجود بھیگ جاتا ہے۔ اس نے بستر کی طرف دیکھا۔ اسلم اسی طرح سو رہا تھا۔ اسے ذرا بھی احساس نہ تھا کہ اس کی بیوی کس ہیجانی کیفیت سے گذر رہی ہے۔ عشرت کمرہ میں خود کو تنہا محسوس کرتی ہے کیونکہ اسلم کا وجود محض فرضی تھا۔

شادی کے چند مہینوں کے بعد ہی اس کے خیال کو تقویت حاصل ہوگئی تھی کہ اسلم بالکل خالی بوتل کی طرح ہے۔ وہ ایسی بوتل ہے جس میں تیل نہیں ہے ــــــــ'

اسلم کی یہ دوسری شادی تھی۔ اس کی پہلی بیوی بارہ سال قبل ایک بچے کو جنم دیتے وقت مر چکی تھی۔ عشرت اپنی بیوہ ماں کے ساتھ اس گھر میں کرایہ دار تھی۔ باپ کی موت کے بعد عشرت کا سب کچھ بکھر گیا تھا۔ وہ نوکری کرنا چاہتی تھی لیکن ماں نے منع کر دیا کہ اکیلی جوان لڑکی کہاں کہاں ماری پھرے گی ــــــــ'

بیوی کی موت کے بعد اسلم کی نظر عشرت پر تھی۔ عشرت خوبصورت اور کم عمر تھی پھر بے بس اور مجبور بھی۔ پہلے تو اس نے عشرت کی ماں کو رام کر کے شادی کے لیے تیار کر لیا لیکن عشرت کسی طور تیار نہ ہوتی۔ ماں نے سمجھایا ــــــــ'

''اسلم اکیلا ہے۔ اچھی کمائی بھی ہے۔ پہلی بیوی کے سارے زیورات برتن باسن تیرے ہی تو ہوں گے بلکہ ایک بسا بسایا گھر مل جائے گا۔''

''لیکن ماں اُن کی عمر......''

''عمر سے کیا ہوتا ہے۔ مرد بھی کبھی بوڑھا ہوتا ہے اور بیٹی تو جانتی ہے کہ میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ میں تیری شادی کسی کنوارے لڑکے سے کر سکوں اور اگر کوئی کنوارا مل بھی گیا تو پتہ نہیں وہ تیرے معیار پر پورا اترے گا یا نہیں ــــــــ اسلم ہر طرح سے تیرے لائق ہے۔''

عشرت خاموش تو ہوگئی مگر اس کا دل کڑھ رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ماں کی آنکھوں پر اسلم کی دولت نے پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ شادی ایک مجبوری بن گئی۔

شادی کے چند ہفتوں کے بعد ہی عشرت نے محسوس کر لیا کہ اسلم ایک زندہ لاش ہے اور اب ایک لاش کے ساتھ اسے اپنی راتیں گزارنی ہیں۔

باہر خلاف توقع بارش شروع ہوگئی۔ رم جھم رم جھم مینہ......عشرت نے کھڑکی کھول دی۔ سامنے تاریکی کی حکومت تھی۔ کبھی کبھی کسی راہ گیر کے گزر جانے کا احساس ہوتا۔ وہ دیر تک کھڑکی سے آس پاس کے بھیگتے مکانوں کو گھورتی رہی اور اپنے ذہن کے اندھیرے گوشے کے لیے کوئی روشنی ڈھونڈتی رہی مگر جب روشنی کی ایک کرن بھی اسے نہ ملی تو وہ تھک ہار کر دوبارہ بستر پر دراز ہوگئی۔

عشرت نے محسوس کر لیا تھا کہ جیسے جیسے شب و روز گزر رہے ہیں۔ اس کی زندگی پھیکی سے پھیکی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی اکتاہٹ بڑھتی جا رہی ہے۔ حسرتوں اور آرزوؤں کا تاج محل مسمار ہو چکا تھا اور اب وہاں دور دور تک کھنڈر تھا جس میں عشرت کی آرزوؤں کی قبر تیار ہو چکی تھی اور اسے اب ہر شب اس مزار پر فاتحہ پڑھنے آنا ہوگا ــــــــ!

اسلم کو بھی احساس ہو چلا تھا کہ اب اس کی بیوی اس سے محبت نہیں کرتی ہے۔ وہ اس سے کھینچی کھینچی سی رہنے لگی ہے لیکن وہ بھی کیا کرتا ــــــــ دن تو کسی طرح گزر جاتا لیکن رات اسے بھی بے چین کر دیتی۔ وہ عشرت سے نظریں چرانے لگا تھا۔ عشرت کی آنکھوں کو وہ دیکھتا تو اس پر وحشت طاری ہو جاتی تھی کیونکہ ان آنکھوں میں بہت سے سوالات تیرتے رہتے مگر اسلم کے پاس کسی سوال کا جواب نہ تھا۔ اس لئے وہ کارخانہ سے لوٹ کر اپنا بقیہ وقت ٹی.وی. دیکھنے میں صرف کرتا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا پھر چپ چاپ سے بستر پر لیٹ جاتا۔

پچھلے ہفتہ اسلم نے اپنے دوست کے بھائی احمر کو اپنا نیا کرایہ دار بنالیا تھا۔ایک کمرہ جو کافی دنوں سے خالی پڑا تھا اسلم نے احمر کے حوالہ کر دیا تھا۔احمر دیکھنے میں خوبصورت اور جوان تھا۔ایم۔اے۔کا طالب علم تھا۔باتونی اور چاپلوس بھی تھا۔وہ عشرت کو بھابی کہنے لگا تھا۔اسلم کبھی کبھی اسے اوپر کے کمرہ میں بلالیتا۔اور اپنے ساتھ کھانے کے لیے اصرار کرتا۔احمر کے لاکھ انکار کرنے کے باوجود اسلم اسے ہاتھ کھینچ کر بٹھالیتا۔عشرت بھی اسلم کا ساتھ دیتی۔

''ہوٹل کا کھانا کھانے سے طبیعت اوب گئی ہوگی۔گھر کا کھانا ہے' کھالو——''

اور پھر سب مل کر کھانا کھاتے' گپیں کرتے اور پھر احمر اپنے کمرہ میں واپس چلا جاتا——

دھیرے دھیرے عشرت کے دل کے کسی گوشے میں احمر کے لئے جگہ بنتی چلی گئی۔اب وہ اسے بڑے شوق سے دیکھنے لگی۔بات کرنے کا بہانہ تلاشنے لگی۔زیادہ سے زیادہ اس کے قریب رہنے کو اس کا دل چاہنے لگا۔وہ اس کی آواز پر لپک پڑتی جیسے وہ اسی کو بلا رہا ہو......آواز دے رہا ہو،مگر ایسا کچھ نہ تھا۔عشرت کا یہ سب وہم تھا۔احمر یونیورسٹی سے لوٹ کر اپنے کمرہ میں بند ہو جاتا اور زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی میں صرف کرتا۔

عشرت کی بتدریج بڑھتی ہوئی توجہ سے احمر کی آنکھوں کی چمک کا رنگ بدلنے لگا تھا اور عشرت یہ محسوس کر رہی تھی کہ احمر اس کے فیصلے کا منتظر ہے——اور ایک دن پانی کا گلاس لیتے وقت احمر کی انگلیاں اس کی انگلیوں کا درجہ حرارت ناپتی محسوس ہوئیں تو عشرت کو اچانک زنجیریں ٹوٹتی محسوس ہوئیں——'

رات کے بارہ بج رہے تھے——'

آج اسلم شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔عشرت جاگ رہی تھی۔ویسے تو وہ مسلسل کئی برسوں سے جاگ رہی تھی لیکن آج اس کے اندر کا طوفان کچھ زیادہ ہی بپھرا ہوا تھا۔وہ اس طوفان کو شانت کرنا چاہتی تھی۔کچھ دیر وہ یونہی پڑی پڑی سوچتی رہی،الجھتی رہی،سوالوں کے دائرے میں گھرتی رہی پھر وہ ایک فیصلہ کُن انداز میں اُٹھی——سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہو کر اس نے خود کو درست کیا اور دروازہ کھول کر دھیرے دھیرے زینے سے نیچے اترنے لگی——

احمر کے دروازہ پر اس نے دھیرے سے دستک دی۔وہ جاگ رہا تھا۔اس نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔عشرت کو دیکھ کر اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔وہ دروازے سے ہٹ گیا۔عشرت بغیر کچھ کہے اندر داخل ہوگئی اور احمر نے بڑی اطمینان سے دروازہ بند کر لیا——!

●●

حیثیت

شام کا وقت تھا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ فضا پر دھندلکا طاری ہو رہا تھا۔ امیت تھکے وجود کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے، اٹیچی ٹیبل پر رکھ کر وہیں صوفے میں دھنس جاتا ہے۔ پیر ٹیبل پر پھیلا کر ٹائی کو اُس نے ڈھیلا کیا اور آنکھیں موندلیں۔ وشاکھا کچن سے ٹاول میں ہاتھ پوچھتی ہوئی نکلی پھر ٹاول کرسی کی پشت پر ٹانگ کر امیت کے بغل میں بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ــــــ اُس نے اپنا ہاتھ امیت کی پیشانی پر رکھا اور پھر دھیرے دھیرے اُس کے بالوں کو سہلانے لگی۔

''ہاں! آج کچھ زیادہ تھک گیا ہوں'' ــــــ امیت نے آنکھیں کھول دیں اور ٹائی اُتار کر صوفے پر ایک طرف ڈال دی۔

''آج لگتا ہے کام زیادہ تھا؟''

''پرائیویٹ کمپنی میں کسی دن کام کم نہیں ہوتا۔ سرکاری نوکری تو ہے نہیں کہ بیٹھ کر کرسی توڑتے رہے ــــــ یہاں باس سر پر سوار رہتا ہے اور کام جو آپ کے سپرد کیا گیا ہے اُسے ہر حال میں مکمل ہونا ہے۔''

''آپ کپڑے بدلیے، میں گرما گرم چائے لاتی ہوں۔ ساری تھکاوٹ دور ہو جائے گی'' ــــــ وشاکھا نے کچن کا رُخ کیا اور امیت اٹیچی لے کر بیڈروم میں چلا گیا۔

ذرا دیر بعد امیت پھر صوفے پر دراز تھا اور وشاکھا کی لائی ہوئی چائے سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ امیت نے چائے کی پیالی اُٹھائی۔ گرم گرم بھاپ اُس کے چہرے سے مس ہو کر بڑا آنند دے رہی تھی، ایک گھونٹ چائے لے کر اس نے چونک کر وشاکھا کی طرف دیکھا۔

''یہ تم چپ کیوں ہو؟ کیا سوچ رہی ہو، کوئی خاص بات؟''

''نہیں، بس یونہی .... پتا جی کا خط آیا ہے؟''

''اُن کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں وہ بالکل ٹھیک ہیں، تبدیلی کی غرض سے وہ یہاں آنا چاہتے ہیں۔''

''وِل کم، آخر اُن کا بھی تو مجھ پر حق ہے، کس مشقت سے پڑھا لکھا کر اتنا بڑا کیا۔ وہ تو تلاشِ معاش میں، میں دہلی چلا آیا پھر تم سے شادی ہوگئی اور ہم دونوں گویا دہلی کے ہوکر رہ گئے۔ جب کبھی اُن کو پیسہ بھیجنا چاہا، انہوں نے منع کر دیا کہ اُنہیں پنشن سے اتنا مل جاتا ہے کہ جو اُن کے لیے کافی ہے اور پھر گھر کا کرایہ بھی آ جاتا ہے''——

''میں بھی چاہتی ہوں کہ پتا جی دہلی آ جائیں لیکن دہلی کے ماحول میں وہ رہ سکیں گے؟''

''کیوں نہیں رہ سکیں گے؟''

''آپ صبح میں آفس چلے جاتے ہیں اور شام کو لوٹتے ہیں۔ میں دن بھر گھر کے کام میں مصروف رہتی ہوں۔ بنٹی اسکول ہی چلا جاتا ہے، آخر اُن کے پاس بھی تو کوئی ہونا چاہئے۔ کیا وہ دیواروں سے باتیں کریں گے۔''

''وشا کھا! پتا جی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بڑے شہروں میں نہیں رہے لیکن وہ جانتے ہیں کہ بڑے شہروں کی زندگی کیسی ہوتی ہے رہتے رہتے عادت پڑ جائے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن گھر میں ایک نوکر ہوتا تو بڑا اچھا ہوتا۔ اُن کی خدمت کرتا۔ اُن کی ضرورت کا سامان اُٹھا کر دیتا۔ اُن کے لیے چائے بناتا۔ آخر وہ آفیسر رہ کر ریٹائر ہوئے ہیں۔ کب کون سی چیز کی ضرورت پڑ جائے، کوئی ایک لڑکا رہتا تو مجھے بھی بڑا اطمینان رہتا۔''——

''ہاں یہ بات تو ہے کہ تمہارا کام بڑھ جائے گا۔''

''آپ کو کب سے کہہ رہی ہوں کہ ایک نوکر رکھ لیجئے مگر آپ میری بات کب سنتے ہیں۔''

''وشا کھا! تم جانتی ہو یہ دہلی ہے اور یہاں نوکر ملنا آسان نہیں، چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی تو کوئی کرے گا نہیں۔ یہاں گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے نوکر ملتے ہیں اور ہمیں مستقل رہنے والا ایک نوکر چاہئے۔ سوچا تھا اس بار گاؤں جاؤں گا تو کسی غریب لڑکے کو ساتھ لیتا آؤں گا۔''

''تین سال قبل بھی تو بنسی کے بیٹے کو آپ نے لایا تھا، چھ مہینے میں ہی اُسے دہلی کی ہوا لگ گئی اور اُس نے دوسری جگہ نوکری کر لی۔''

''یہ تو چلتا رہے گا۔ ہم کسی کو باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔''

''خیر آپ دیکھئے، اگر کوئی لڑکا مل جائے تو رکھ لیں گے۔''

''دیکھتا ہوں۔ دو چار لوگوں سے کہتا ہوں'' —— امیت نے اُٹھ کر ٹی وی آن کر دیا، تبھی کال بیل بجتا ہے۔ وشا کھا اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔

''گڈ اِیوننگ ممی... گڈ اِیوننگ پاپا'' —— بنٹی ہنستا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔''

''گڈ اِیوننگ مائی سن'' —— امیت نے بنٹی کی طرف دیکھا۔

''کیسا رہا بیٹا پکنک'' —— وشا کھا نے دریافت کیا۔

''ویری فائین' بہت انجوائے کیا۔''

''کھانا کھاؤ گے۔''

''پاپا کھا چکے؟''

''نہیں۔''

''تو چلئے ساتھ ہی کھا لیتے ہیں۔بس دومنٹ میں فریش ہوکر حاضر ہوا'' ـــــ بنٹی گنگناتا ہوا اپنے کمرہ کی طرف چلا گیا ـــــ

دہلی کی سڑکیں سورج نکلنے سے بہت پہلے ہی بیدار ہو جاتی ہیں۔آمدورفت کی رونق بڑھ جاتی ہے۔خرید وفروخت کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔گاڑیاں زناٹے سے گذر جاتی ہیں۔کوئی سوار ہو جاتا ہے،کوئی چھوٹ جاتا ہے۔چھوٹنے والا گھنٹوں اگلی بس کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے۔لمبی اور خوبصورت کاریں ژوں ژوں کر کے گذر جاتی ہیں۔کاروبار معمول کے مطابق جاری ہو جاتے ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے جو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ایک دوڑ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔وشا کھا کھڑکی میں کھڑی یہ مناظر دیکھ رہی تھی کہ دفعتاً کال بیل کی موسیقی بھی جاگ اُٹھتی ہے۔وشا کھا اپنا پلو سنبھالتی ہوئی دروازہ کھولتی ہے۔پتا جی سامنےکھڑے تھے۔اُس نے جھک کر جلدی سے چرن چھوئے،اُن کے ہاتھ سے اٹیچی لے لی اور انہیں اندر لائی ـــــ

پتا جی کے آجانے سے گھر بارونق ہو گیا۔ہر فرد خوش تھا لیکن وشا کھا کے کام میں بہر حال اضافہ ہو گیا تھا۔وہ کچن سے بڑبڑاتی ہوئی نکلی ـــــ

''حد ہو گئی،ایک ایک چیز کے لیے مجھے ہی باہر نکلنا پڑتا ہے۔کب سے کہہ رہی ہوں کہ ایک نوکر رکھ لیجئے لیکن وہ میری بات کب سنتے ہیں۔ اگر کہنے سننے سے نہیں ملتا تو اخبار میں اشتہار دے دینا چاہئے ـــــ''

''کیا بات ہے بہو، کیوں خفا ہو رہی ہو؟''

''پتا جی! دیکھئے نا،نمک ختم ہو گیا۔اب نمک لانے کے لیے بھی مجھے ہی باہر جانا پڑے گا۔گھر کا کام بھی کرو اور باہر سے سامان بھی خرید کر لاؤ۔''

''تم کیوں گھبرا رہی ہو،لاؤ میں لا دیتا ہوں'' ـــــ پتا جی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ جائیں گے؟نہیں،یہ اچھا نہیں ہے!'' ـــــ وشا کھا سٹپٹا سی گئی۔

''ارے اس میں کیا ہے بہو،یہ تو اپنا کام ہے۔ہم بھی تو اس گھر کے ایک فرد ہیں۔نکڑ پر ہی تو دکان ہے،میں ابھی لے کر آتا ہوں۔''

دین دیال تیزی سے باہر نکل جاتے ہیں اور چند ہی منٹ بعد نمک لے کر واپس آجاتے ہیں ـــــ

''لو بہو،یہ رہا نمک۔''

وشا کھا کچن سے برآمد ہوئی اور نمک کا پیکٹ ہاتھ میں لے کر پھر سے کچن میں داخل ہونے لگی۔

''بہو ـــ!'' ـــ دین دیال نے آواز دی۔

''جی پتاجی!''

''اگر ممکن ہو تو ایک کپ چائے بنادو۔''

''ابھی بناتی ہوں پتاجی۔بس آپ اسی طرح کہہ دیا کیجئے۔کوئی سنکوچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔''

وشاکھا کچن میں داخل ہوگئی مگر چند لمحوں کے بعد پھر ڈرائنگ روم میں آئی۔

''پتاجی!اب دیکھئے نا۔دودھ کو بھی ابھی ہی ختم ہونا تھا۔میں ابھی دودھ لےکر آتی ہوں، تب تک آپ ٹی وی دیکھئے۔''

''تم کہاں جاؤ گی۔لاؤ میں دودھ بھی لے آتا ہوں۔''

''ابھی ابھی تو آپ نمک لےکر آئے ہیں۔نہیں،آپ تھک گئے ہوں گے۔''

''تو کون دو چار کیلومیٹر چل کر آیا ہوں۔سامنے والی گلی میں ہی تو دودھ کی دکان ہے۔ابھی گیا ابھی آیا۔''

دین دیال دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔

''پتاجی پیسے تو لیتے جایئے۔''

''ارے پیسے کس لیے،کون ہزار دو ہزار لگیں گے۔بیس روپیہ کا ایک کیلو ہی تو آتا ہے،لے لوں گا۔''

''پھر بھی پتاجی،امیت مجھ پر بہت بگڑیں گے۔''

''ارے! اُسے بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے'' —— دین دیال تیزی سے باہر نکل گئے۔

رفتہ رفتہ دین دیال کا باہر سے سامان لانا معمول سا بن گیا۔کبھی کبھی کئی کئی چکر لگانے پڑتے،وہ تھک جاتے۔کبھی کبھی تو دس بارہ کیلومیٹر کا بس کا سفر بھی کرنا پڑتا —— وہ کام کے تعاقب میں بھاگتے اور کام اُن کے تعاقب میں۔مورننگ واک کے لیے نکلتے تو دودھ لےکر لوٹتے۔بنٹی کو بس اسٹاپ تک چھوڑتے،چھوٹے چھوٹے سامان خود لے آتے لیکن آہستہ آہستہ کام کا بوجھ غیر محسوس طور پر بڑھتا چلا گیا۔شروع شروع تو دین دیال بڑی لگن اور چاؤ سے سارا کام انجام دیتے رہے لیکن جب کام کا سلسلہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا ہے تو اُنہیں دھیرے دھیرے کوفت ہونے لگتی ہے۔

دن تپا ہوا ہے۔سورج اگرچہ آسمان کے مشرقی کنارے کی سیڑھیوں سے آہستہ آہستہ اُتر رہا ہے لیکن گرمی اور تپش میں ذرّہ برابر کمی نہیں۔دین دیال سامان کا تھیلہ لیے بس اسٹاپ پر کھڑے بس کے منتظر ہیں۔لوگ باگ جلدی جلدی گھروں کو بھاگ رہے ہیں۔دین دیال جب انتظار سے اوب گئے تو انہوں نے آٹو کو آواز دی اور خرچ کا زیادہ بوجھ اٹھائے گھر لوٹے —— انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اُن کی حیثیت اس گھر میں ایک نوکر جیسی ہوجائے گی۔وہ بے چین ہواُٹھے......وہ اپنی حیثیت کا اندازہ لگا کر سر سے پاؤں تک کانپ گئے۔اُس رات انہیں نیند نہیں آئی۔دفعتاً وہ اُٹھ کر کمرہ میں ٹہلنے لگے اور پھر ساری رات وہ چھت سے نظریں ٹکائے سوچتے رہے،دیواروں کو گھورتے رہے۔بالآخر وہ ایک فیصلہ پر پہنچ گئے اور فیصلہ تھا اپنے گاؤں کی واپسی! —— صبح انہوں نے یہ فیصلہ بیٹے اور بہو کو سنا دیا

امیت پتا جی کے اس فیصلے پر چونک پڑا۔ ذرا دیر خاموشی سی رہی، وشاکھا کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں، بالآخر امیت گویا ہوا ——

''پتا جی! اتنی جلدی آپ کیوں جا رہے ہیں؟ کیا یہاں آپ کو کوئی تکلیف ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے امیت! جانتے ہو کہ بڑھاپے کے مزاج میں یکسوئی نہیں ہوتی۔ چھ مہینے رہ گیا، تم لوگوں کو جی بھر کر دیکھ لیا۔ اب پھر کبھی آ جاؤں گا ——''

''لگتا ہے پتا جی کو یہاں ضرور کوئی تکلیف ہوئی ہے'' —— وشاکھا نے تاسّف بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں بہو، تکلیف کس بات کی مگر کیا ہے کہ پتہ نہیں کیوں گاؤں بہت یاد آ رہا ہے، اس لیے جانا چاہتا ہوں۔ اگر وہاں بھی دل نہیں لگا تو پھر واپس آ جاؤں گا۔ آخر تم لوگوں کے علاوہ میرا اس دنیا میں اور کون ہے ——''

''دادا! مجھے لگ رہا ہے آپ واپس نہیں آئیں گے'' —— بنٹی جو بہت دیر سے سب کی باتیں سن رہا تھا، اچانک بیچ میں بول پڑا۔

''کیوں بنٹی، کیوں؟'' —— دین دیال نے اپنے پوتے کی طرف دیکھا۔

''کیوں کہ بازار کا چکر لگاتے لگاتے آپ بہت تھک گئے ہیں ——''

''ارے نہیں بنٹی! گھر کا کام کرنے سے کوئی تھکتا ہے بھلا۔ میں آؤں گا بیٹے اور ضرور آؤں گا۔''

''میں بھی آپ کو بلاؤں گا دادا، مگر اُس وقت جب گھر میں کوئی نوکر آ جائے گا——

●●

انّا کو آنے دو

پر

اظہار خیال

وہاب اشرفی:

’’انا کو آنے دو‘‘ میں احمد صغیر کی فنی للکار خاصے کی چیز ہے اور پسماندہ اور سب الٹرن کے لیے مرہم اور روشنی کا کام سرانجام دیتی ہے۔

(مابعد جدیت مغمرات وممکنات)

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

اردو افسانہ نگاروں کی نئی کھیپ میں احمد صغیر کا ذکر ناگزیر ہے۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ’’مُنڈیر پر بیٹھا پرندہ‘‘ شائع ہوا تو اس نے بہت سے ناقدین اور افسانہ نگاروں کو چونکا دیا۔متعدد لوگوں نے اعتراف کیا کہ احمد صغیر اردو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کرنے کے حامل ہیں۔غنیمت یہ ہے کہ احمد صغیر نے ان اہم افراد کے اعترافات کا وہ تاثر حاصل نہیں کیا جس کے نتیجے میں فن کار اپنے آپ کو معیار کی اعلیٰ بلندی پر تصور کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔سچا فن کار تعریف وتحسین سے یہ درس لیتا ہے کہ اسے اس راستے پر آگے بھی سفر کرنا چاہئے اسلئے کہ کامیابی کی آخری منزل کوئی نہیں ہوتی۔ یہاں بس سفر ہی سفر ہے۔اچھے قاری یا ناقد کی رائیں فنکار کو مہمیز کرتی ہیں اور اسے آگے بڑھنے

کے لئے اکساتی رہتی ہیں۔

چنانچہ احمد صغیر کو ان ہمت افزائیوں نے افسانہ نگاری کی آگے کی منزلیں طے کرنے کا حوصلہ دیا اور اس کے نتیجے میں ۲۰۰۱ء میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''انّا کو آنے دو'' شائع ہوا۔ اس کی آمد نے ان کی تخلیقی شخصیت میں اور اضافہ کیا۔ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اس مجموعے کے چند بہترین افسانوں نے ان کے لئے تخلیقی سمت کی راہ متعین کر دی ہے۔

احمد صغیر کے اس افسانوی مجموعے میں یوں تو ''سایہ''، ''روشنی بلاتی ہے''، ''سوچ کا کرب'' اور ''مریادا ورتانڈ و رقص'' جیسی رسمی اوسط درجے کی کہانیاں بھی موجود ہیں۔ لیکن احمد صغیر کی اصل پہچان ان کہانیوں سے بنتی ہے جن میں احتجاج اور انقلاب کی چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔ ابھی جن کہانیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے فنکار کے سماجی، سیاسی اور عصری شعور کا اندازہ ضرور ہوتا ہے مثلاً ''مریادا اور تانڈ و رقص'' میں اپنے ملک کے تہذیبی انتشار کی عکاسی ملتی ہے جہاں مذہب کے نام پر سیاست کرنے والے ملک کی سالمیت اور اتحاد و یکجہتی کو برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کہانی ''بھگوان کے نام پر'' بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ''سوچ کا کرب'' خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت کرتی ہے۔ اس میں اس بیداری کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ جونئی نسل اپنے بزرگوں کے مقابلے میں زیادہ سنجیدگی کے ساتھ محسوس کرتی ہے۔ کہانی ''روشنی بلاتی ہے'' ایک عام روایتی کہانی ضرور ہے لیکن بے روزگاری کی صورت میں جذبات کی شکست کا منظر نامہ جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس سے عمومی موضوع میں خصوصیت پیدا ہوگئی ہے۔

ان کہانیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے میں احمد صغیر کے ان فن پاروں کا ذکر بطور خاص کرنا چاہتا ہوں جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز بناتے ہیں اور کہیں کہیں تو ان کا قد اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ وہ ماقبل نسلوں کی فنی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ خاص طور پر ان کی کہانیوں ''انّا کو آنے دو''، ''پیاسی ہے زمیں پیاسا آسماں''، ''اوورٹائم''، ''جنگ جاری ہے'' اور ''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی'' کی بنیاد پر پیش کر رہا ہوں۔ ان کہانیوں میں احتجاج کی تیز لَے اور فن کی جمالیات کا آتنا حسین امتزاج ہے کہ شاید و باید —Establishment کے خلاف لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ اکثر و بیشتر یہ ہوا ہے کہ ایسی کہانیاں کبھی تو موضوعات کی خارجی پیشکش پر غیر ضروری ارتکاز کی نذر ہو گئیں اور کبھی بعض افسانہ نگاروں نے ان میں علامت و اشارت کے وہ گُر پیچ دکھانے شروع کئے کہ اصل موضوع اور جذبے کی تاثیر ہی ختم ہوگئی۔ میں احمد صغیر کے فن سے اس لحاظ سے خاص طور پر مطمئن ہوں کہ وہ ایک مشن اور Committment کے ساتھ کہانی کی جمالیات کا ایک خوبصورت آمیزہ تیار کر لیتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کہانیوں کے پیش نظر احمد صغیر کے وہ نظریات اور ان کے آئیڈلس ہویدا ہوتے ہیں جن سے آج کے معاشرے کو بدلا جا سکتا ہے۔ پریم چند نے شانتی اور مفاہمت کا جو وسطی راستہ اپنایا تھا وہ مفاد پرست اور مطلب پسند سیاست دانوں کی ''دانشوری'' کی نذر ہو چکا ہے۔ اب واضح طور پر آہستہ روی، نرم خوئی اور مفاہمت کا ماحول نہیں رہا۔ احمد صغیر نے پریم چند کے نامکمل مشن کو آج کے دور میں وہ راستہ دکھایا ہے جس سے نصرت حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کی کہانیاں کلاس وار کی عکاسی ہی نہیں بلکہ ان سے پیدا شدہ مثبت نتائج کی بشارت بھی دیتی ہیں۔ انہوں نے جگہ جگہ جھوٹی Territorialism اور Regionalism کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ انہوں نے انّا، منگی، گلبیا اور بھیکو جیسے کرداروں کے ذریعے

ہمیں ایسی کہانیاں بخشی ہیں جوفن کی سطح پر بھی سرشار کرتی ہیں اور ہمارے اندر وہ توانائی بخشتی ہیں جن سے ہم حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ احمد صغیر نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ اپنے لئے راستہ بنایا ہے۔انہیں اسی راستے پر چلنا چاہیئے۔

لیکن مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان چند کہانیوں کے بعد انّا کہاں غائب ہو جاتا ہے۔اس نے جو جنگ شروع کی ہے وہ آگے چل کر سرد کیوں لگتی ہے؟اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی دوسری کہانیوں میں بھی طبقاتی بیداری کی لہر موجود ہے۔لیکن انّا جیسا کردار کہیں نہیں ملتا۔اسلئے آگ لہکتی نہیں دبی دبی سی لگتی ہے اور کہیں کہیں تو وہ اتنی تہہ نشیں ہو جاتی ہے کہ پریم چند یاد آ جاتے ہیں۔

ایک بات اور یہ کہ انقلاب کا بوجھ صرف انّا جیسے چند کرداروں کے کاندھے پر کیوں رہتا ہے دوسرے لوگ اسے Share کیوں نہیں کرتے۔خاص طور پر احمد صغیر کے یہاں نسوانی کردار، روایتی مجہولیت اور انفعالیت کے شکار کیوں نظر آتے ہیں۔ان میں استحصال کے خلاف بیزاری تو دکھائی دیتی ہے مگر فعال بیداری نظر نہیں آتی۔کیا عورت کا جہاد گُلبیا سے آگے نہیں بڑھ سکتا جو رنجیت سنگھ سے تنگ آ کر اپنے گاؤں واپس ہو جانا چاہتی ہے۔[اوور ٹائم] یا یہ مریم تک محدود رہے گا جو دشمن سپاہی سے ایک مجاہد حاصل کر کے اپنی کوکھ میں محفوظ کر لیتی ہے [جنگ جاری ہے]؟ میں نے احمد صغیر سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔

ڈاکٹر مثنیٰ رضوی

''انّا کو آنے دو'' احمد صغیر کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔اردو کے جدید ترین افسانوی ادب میں اُن کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔اُن کے افسانوں میں احتجاج کی جو تیز لہر پائی جاتی ہے وہ اُن کی شناخت بن چکی ہے۔اس مجموعہ میں بھی وہ لہر پوری آن بان سے موجود ہے۔اُن کی کہانیوں میں زندگی کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ زمینی سچائیوں سے اٹوٹ رشتہ رکھتی ہیں۔اُن میں رنگین اور پراسرار تصورات کے محل نہیں دکھائی دیتے۔اُن کی کہانیاں زمین سے اس طرح جڑی ہوتی ہیں کہ ہم عوامی زندگی کے سماجی، معاشی اور تہذیبی مسائل سے الگ کر کے اُن کا مطالعہ کر ہی نہیں سکتے۔اُن کا دماغ سوچتا ہے تو اُن کا دل بھی دھڑکتا ہے۔اُنہوں نے اپنی کہانیوں کا تانا بانا سنگین معاشرتی اور مادی حقائق کے شعور اور احساس کے وسیلہ سے بُنا ہے اور اس کام کو انہوں نے اتنی فنی چابکدستی اور ہنرمندی کے ساتھ کیا ہے کہ اُن کی اکثر کہانیاں ایک اکائی کی شکل میں اُبھر کر قارئین کے دل و دماغ کو چھو لیتی ہیں۔کہیں جھول نظر نہیں آتا تار و پور بکھرتے نظر نہیں آتے لفظوں کا فضول اور بے جا صرف نہیں ملتا اور سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ کئی کہانیاں کسی مرکزی خیال یا تاثر کی گرفت میں رہنے کی بدولت فنی اعتبار سے بڑی موثر اور خوبصورت کہی جانے کی مستحق قرار پاتی ہیں۔بعض کہانیاں ایسی بھی ہیں جن پر صحافتی رنگ غالب آ گیا ہے اور لہجہ خطیبانہ محسوس ہوتا ہے مگر اُن کی تعداد زیادہ نہیں۔

اس مجموعہ کی کی بعض کہانیاں عہد حاضر کے انتہائی اہم مسائل سے بنرد آزما ہیں۔طبقاتی کشمکش اور جدوجہد نے اتنی شدت اختیار کر لی ہے کہ خوف اور دہشت کے سائے چاروں طرف لرزاں نظر آتے ہیں۔آیئے ذرا اس کہانی پر ایک سرسری نظر ڈالیں جس سے یہ مجموعہ موسوم ہے میری مراد ''انّا کو آنے دو'' سے ہے۔پھلمتیا ایک دبی، کُچلی مظلوم عورت ہے جس کے گاؤں کے پانچ پانچ افراد کو محض اس لئے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا کہ اُنہوں نے کارو مستری کے گھر میں جنم لیا تھا جنہوں نے عدالت میں گاؤں کے مکھیا کے خلاف سچی گواہی

دیدی تھی۔ پورا گھر جلا کر خاکستر کر دیا گیا تھا۔ پھلمتیا کی پھول سے بچی بھی جھلس گئی تھی۔ انّا نام کا ایک نوجوان جو ظلم اور استحصال کے خلاف لڑنے کے لئے اپنی جان کی پروا کئے بغیر سینہ تان کر میدان میں اتر آیا تھا جُرات اور بے باکی جوش اور ولولہ کی علامت بن کر گاؤں کے ستم زدہ لوگوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ دہشت اور خوف کے اس اندھیرے میں وہ اُمید کی کرن بن کر چمکا تھا۔ پھلمتیا اس کے بارے اس طرح سوچتی ہے:

''کیا اکیلا کوئی انّا اس نظام کو بدل دے گا یا ہر گھر میں ایک انّا کا وجود اب لازمی ہے؟ ہر گاؤں ہر قصبہ اور ہر گھر میں انّا کی ضرورت ہے جو موجودہ نظام کو بدلنے میں معاون ہو سکے لیکن اس قدر انّا آئیں گے کہاں سے؟ برسوں میں صرف ایک انّا پیدا ہوتا ہے اور بس ایک دن میں اسے ختم کر دیا جاتا ہے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے۔ تو کیا ہر ماں کو ایک انّا......؟''

پھلمتیا یہ سوچ ہی رہی تھی کے اس نے جیپ پر سوار دو طاقت اور غرور کے نشہ میں چور جوانوں کو یہ کہتے سنا — ''بڑے نکسلائٹ بنتے ہیں سالے۔ ایک ہی رات میں ٹھنڈے پڑ گئے'' — پھلمتیا نے چلّا کر کہا کہ ''انّا کو آنے دو''۔ طبقاتی جدوجہد کیا رنگ لا رہی ہے اور کس طرح گاؤں کی ایک مجبور بے بس عورت کی نفسیات کو تیزی سے بدل رہی ہے یہ سب کچھ محض ایک فقرہ میں سمٹ آیا ہے۔ یہ کہانی احمد صغیر کے فکری اور فنی شعور کا ایک خوبصورت آئینہ ہے۔

اب ذرا طبقاتی کشمکش پر ہی مبنی ایک دوسری کہانی پر طائرانہ نگاہ ڈالیں جس کا انداز کسی قدر مختلف ہے۔ ''پیاسی ہے زمیں پیاسا آسماں'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں منکی نام کی ایک غریب عورت نشی نام کی ایک خوش حال خاتون کے گھر میں ملازمہ ہے وہ اپنے آوارہ اور شرابی شوہر کی مار پیٹ سہتے ہوئے اس نوکری کے ذریعہ اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے ایک دن بچے کو دودھ نہیں مل پایا اس لئے وہ لگاتار روتا رہا کسی طرح چُپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا مُنکی نے اپنی مالکن کو اپنی مجبوری بتائی اور تھوڑا سا دودھ بچے کے لئے مانگا مگر وہ بہانہ بنا کر ٹال گئی۔ بچے کے لئے انکے یہاں دودھ نہیں تھا لیکن گنیش جی کی پیاس بجھانے کے لئے انہوں نے منکی کو پورا گلاس بھر کر دودھ دے دیا۔ مُنکی گنیش جی کو دودھ پلانے کو جاتے ہوئے سوچنے لگی اگر آج بھی دودھ والا نہیں آیا تو پھر میرا بچہ......!

اس کے قدم رکنے لگے......

گنیش جی کو پلانے کے لئے مالکن کے کچن میں دودھ نکل آتا ہے مگر میرے بچے کے لئے؟ مُنکی رک گئی اس نے ایک نظر مندر کی طرف جاتی بھیڑ کو دیکھا، کچھ سوچا اور پھر دھیرے سے اپنے گھر کی طرف مڑ گئی۔

اس خوبصورت افسانہ میں خوش حال طبقہ کی کھوکھلی اور دردمندی سے عاری مذہبیت کا پردہ بغیر کچھ کہے ہوئے محض واقعات کی بنت سے فاش ہو جاتا ہے۔ خوش حال اور صاحب اقتدار طبقہ کی یہی ذہنیت اور سنگدلی طبقاتی آویزش کو جنم دیتی ہے اور زندگی کو دہشت اور سراسیمگی کی آماجگاہ بنا دیتی ہے۔ آیئے اب اس کہانی کی بات بھی ہو جائے جو ''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے'' دہشت اور روز روز کے خون خرابہ سے عاجز آئے ہوئے لوگوں کی نفسیات کا یہ اچھا مطالعہ ہے۔ میڈیا والوں سے اپنا دُکھڑا بیان کرتے کرتے گاؤں والے بے حسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایک کہانی کار کو دیکھ کر گاؤں کی لڑکی اسے اخبار نویس سمجھ بیٹھتی ہے اور اُلجھے ہوئے لفظوں میں اپنی بیزاری کا اظہار کرتی ہے:۔

کوی اکھبار والے ہوں گے؟ ای کھبر چھاپو گے کہ ای جگہ بڑا کھون کھرابہ ہوا ہے۔ پھوٹو بھی۔ بس''
کہانی کار کا حال بھی سنئیے!
میں اپنا زخمی دل لئے لوٹ آیا ہوں۔ کاغذ کے اوراق میرے ٹیبل پر بکھرے پڑے ہیں۔ قلم میرے ہاتھ میں ٹھہرا ہوا ہے اور ذہن میں وہ سارا منظر ہے۔ کہانی بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ جب تک میں ایک کہانی مکمل کر رہا ہوں گا کوئی دوسرا گاؤں جل اُٹھے گا۔
ناانصافی، جبر واستحصال اور ناداری سے آنکھیں چار کرتی ہوئی ان افسانوں سے خاصی مختلف نوعیت کی کچھ کہانیاں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جیسے ''اور ٹائم'' ''اندھیرے جاگتے ہیں'' جن میں گلبیا اور عالیہ کی بے بسی اور بے اطمنانی کو افسانہ نگار نے سماجی اور معاشی نابرابری کے تناظر میں دیکھا ہے یا ''سایہ'' جس میں برسوں کی تھکن اور پامالی طاقت اور خود اعتمادی بن کر رنجنا کی شکل میں اُبھری ہے اور اعلان کر رہی ہے کہ عورت مرد کے سہارے کے بغیر بھی جی سکتی ہے۔
احمد صغیر کی تخلیقات میں ارضی حقائق اور طبقاتی کشمکش کا جو شعور ملتا ہے وہ اُن کی فن کارانہ صلاحیت اور جوہر کے امتزاج سے بعض کہانیاں نئے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے لیکن اُنہیں اپنی اصل منزل تک پہونچنے کے لئے ابھی کڑی محنت کرنی ہے۔ طرز اظہار اور اسلوب بیان کے نئے امکانات تلاش کرنے ہیں سادگی کو پُرکاری عطا کرنی ہے اور زبان پر قدرت حاصل کرنی ہے۔ اُن کی کہانیاں جن مسائل سے برسرِ پیکار ہیں وہ بڑے اہم سنگین اور پیچیدہ ہیں اُن کو گرفت میں لانے کے لئے جن مراحل سے گزرنا ہے وہ بڑے کٹھن ہیں لیکن وہ جس عزم اور استقلال کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن ہیں اُسے دیکھتے ہوئے بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں کامیاب ہوں گے۔

م۔ق۔ خان:

''انّا کو آنے دو'' کے بیشتر افسانے اپنے اردگرد ظہور پذیر ہونے والے واقعات وسانحات پر مبنی ہیں۔ وہ اس مجموعہ میں علامت، استعارہ اور ابہام میں کہیں بھٹکتے نظر نہیں آتے۔
اس مجموعہ کا پہلا افسانہ ''انّا کو آنے دو'' بہار کے دیہی علاقوں میں پیش آنے والے واردات، حادثات اور سانحات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اونچی نیچی ذات، امیر غریب طبقات میں جس طرح خون خرابہ کا منظر ہے، اس کی من وعن عکاسی ہے۔ آئے دن اخباروں کی سرخیوں میں اس دہشت گردی اور بربریت کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ کس طرح معصوم نہتے اور غربت کے مارے لوگ اگر اپنے حقوق کے لیے متحد ہو کر آواز بلند کرنا چاہتے ہیں تو بااثر لوگ انہیں کچل کر رکھ دیتے ہیں اور ان کی تنظیم کا مذاق اڑاتے ہیں۔
انّا کو پس ماندہ طبقہ کا نجات دہندہ کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس کے کارناموں کو یاد کرتی ہوئی پھلمتیا جو اس کہانی کی مرکزی کردار ہے سوچتی ہے ''کیا اکیلا کوئی انّا اس نظام کو بدل دے گا یا ہر گھر میں ایک انّا کا وجود لازمی ہے؟''
مجھے پورا ایقان ہے کہ ''انا کو آنے دو'' اردو کی افسانوی دنیا میں نہ صرف محبوب ومحترم ہوگا بلکہ تخلیقی کائنات کو نئی لہروں اور موجوں سے بھی آشنا کرے گا...

ڈاکٹر کوثر مظہری:

احمد صغیر کو اللہ نے کہانی کار سے فنکار بنا دیا ہے یعنی وہ وہ اس قوت اظہار سے متصف ہیں جس کی مدد سے جذبات و تجربات صفحہ قرطاس پر اترتے ہیں۔ ان کا پہلا کہانیوں کا مجموعہ ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی وقت فکشن نگاروں اور کچھ سیدھے سچے ناقدوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اب جب کہ ''اناّ کو آنے دو'' منظر عام پر آیا ہے تو نئے فکشن میں ایک تحرک، ایک ہلچل سی محسوس ہو رہی ہے۔

احمد صغیر کا اسلوب اپنے ہم عصروں میں پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کی نثر میں جو بے چینی کی کیفیت اور کہانی کا دفعتاً شروع ہونا ملتا ہے ایک طرح سے یہی ان کی شناخت بھی ہے اور خط امتیاز بھی۔

پہلے مجموعے میں ''پرندہ'' مختلف جہات کے ساتھ غالب تھا اور اس مجموعے میں کردار اور واقعات کا انقلاب حاوی ہے۔ ''اناّ کو آنے دو'' بھی اسی انقلابی رجحان کا سابقہ یا لاحقہ ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند میلانِ فکر قعر گمنامی میں چلا گیا بلکہ اب بھی نئی نسل میں کچھ ادیبوں کے ذہن و دماغ کا تتمہ بن کر سائے کی طرح وہ میلان چل رہا ہے۔ اس کی بھی اپنی ایک توجیہ و تاویل ہے۔ وہ یہ کہ ترقی پسند تحریک کے لیے جواز فراہم کرنے والے اسباب اور سیاہ علائم آج بھی معاشرے میں موجود ہیں۔ خون، آگ، ہنگامہ، دہشت، تعصب، نفرت و عداوت، مذہبی ولسانی تفریق، نسلی اور علاقائی Feeling نے معاشرے کے چند سر پھرے یا دبے کچلے نوجوانوں میں، بوڑھی عورتوں میں انقلابی لاوا پیدا کرنے کا سامان فراہم کرتی ہے — ہم آپ اسے بھلا نہیں سکتے۔ احمد صغیر باطن کی آنکھ سے ظاہر کی غلاظت کو دیکھ رہے ہیں اور مسلسل اسے اپنے تجربے کا حصہ بنا رہے ہیں۔ یہی وہ تجربہ ہے، یہی وہ احساس ہے جو فنکار کو غیر فنکار سے الگ کرتا ہے۔ احساس کو جنوں کی صفت سے آراستہ کر کے صحرائے قرطاس کی سیر کرانا احمد صغیر کو آتا ہے۔ اس لیے وہ ذرّے میں کائنات دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار پر یاست اور لب بستگی کے آثار چھائے رہتے ہیں۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو یا پھر گھن گرج کے ساتھ جب گویا ہوتے ہیں تو گویا آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ یہ نامتوازن رویے زندگی کے نامتوازن روّیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

(شاعر)

مشرف عالم ذوقی

منڈیر پر بیٹھا پرندہ تشکیک اور خوف کی علامت ہے۔ پہلے افسانوی مجموعے کی زیادہ تر کہانیوں میں خوف' اندھیری رات' خاکی بوٹوں کی ٹاپ کی علامتیں استعمال کی گئی ہیں اور ان سے موجود فضا' بدلتے حالات اور تیزی سے آتی ہوئی تبدیلیوں پر شب خون مارنے کا کام لیا گیا ہے ان کے درمیان ہم منڈیر پر بیٹھے پرندے کو ایک ایسے استعارے کے بطور محسوس کر سکتے ہیں جو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ یعنی احمد صغیر کا قلم ڈیجیٹل کیمرہ کی آنکھیں بن کر فریم میں تیار شدہ مناظر کو قید کر لیتا ہے۔

''اناّ کو آنے دو'' احمد صغیر کے افسانوی سفر کا دوسرا مضبوط پڑاؤ ہے یعنی منڈیر کے بعد کا قدم۔ خوف و دہشت کے جنگوں میں رہنے والوں کو اب اناّ کا انتظار ہے مگر اناّ کون؟...... اناّ چپ چاپ' اچانک خاموشی سے مضبوطی اور احتجاج کی آواز بن جاتا ہے۔ برسوں سے سوئے' لگاتار ظلم سہتے رہنے والوں کو انا کا انتظار ہے تبھی تو پھلمتیا آپ ہی آپ کہہ اٹھتی ہے ''انا کو آنے دو سالو' پتہ چل جائے گا۔

(آج کل مارچ ۲۰۰۲)

●●●

ایک پُر اسراریت جوان کے نئے اُجالے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ احمد صغیر کی کہانی ''رات'' نئی کہانی کے اس موسم میں یوں تو فساد اور دنگے کے ماحول میں آنکھیں کھولتی ہے لیکن فوراً ہی احتجاج کا سُر اُسے فیض احمد فیض کی مشہور نظم ''انتظار'' بنادیتا ہے۔

(نئی کہانی کچھ شیڈس 'استعارہ فکشن نمبر)

حقانی القاسمی:

''انا کو آنے دو'' کے بارہ افسانے ہماری بارہ راتوں کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ دراصل وہ بارہ چشمے ہیں جو تخلیقی ذہن کی ضرب سے فکشن کے دریا میں پھوٹ پڑے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے بارہ دائرے ہیں جن میں فکشن کے موج صد رنگ کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان افسانوں میں ''انا کو آنے دو'' مرکزی کہانی ہے اور یہ کہانی ایک نئی زمین، نئے آسمان، نئے چاند سورج اور نئے ستاروں کے جلو میں لکھی گئی ہے۔ کہانی مختصر سی ہے مگر اس کا تاثر بہت گہرا ہے۔ پھلمتیا اس کا ایک ایسا کیرکٹر ہے جسے اگر اور مانجھا گیا تو ہوری کی طرح کسی دن ایک زندہ کردار بن جائے گا۔ دوسرا کردار اَنّا، ایک علامت ہے مزاحمت اور مقاومت کی، جدوجہد اور بغاوت کی، سماجی سیاسی نظام کو بدلنے والے ایک انقلابی انسان کی۔

احمد صغیر کی کہانیوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں نئی برق تجلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ عذاب روشنائی سے لکھی، ان کی کہانیوں کے سینے میں جو آگ ہے، وہ کاغذ پہ پھیلتی نظر آتی ہے۔ احمد صغیر، آج کے افسانہ نگار ہیں، اس لیے ان کے مسائل اور وقوعے بھی آج کے ہیں۔ ان کے تخلیقی اضطراب اور تحرک کو ان کے افسانوں میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کہانی کیسے لکھی جاتی ہے، اس آرٹ سے احمد صغیر آشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں نہ ابہام ہے، نہ اہمال اور نہ اغلاق اور نہ ان کی کہانیاں ترسیل کی ناکامی کی نذر ہوتی ہیں۔ زمین اور ارضی مسائل و متعلقات سے ان کا گہرا ارتباط، ان کی کہانیوں کو فنی اور فکری جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔ احمد صغیر کے سینے میں 'دہشت' کی نہیں 'درد' کی جوالا بھڑک رہی ہے اور یہی جوالا ان کے نظامِ فکر و فن اور اظہاری جمالیات کو روشن رکھتی ہے۔ ان کے افسانے، ایک خاص تناظر اور سیاسی سیاق و سباق میں لکھے گئے ہیں۔ بہار کے مخصوص سیاسی سچویشن سے شناسائی کے بغیر ان کے فکشن کی تفہیم، تفسیر و تقطیر ممکن نہیں۔

احمد صغیر کی کہانیاں، بہت مختصر مگر بہت ہی معنی خیز ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں کا جو علاقائی تناظر اور مقامی تشخص ہے، یہی تناظر اور تشخص ان کہانیوں کو نئی معنویت، نئی وسعت اور آفاقیت عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ جب تک علاقائی جڑوں کی تلاش کی کوشش نہیں کی جائے گی تب تک کوئی بھی ادب آفاقی نہیں ہوسکتا۔ علاقائیت کی کوکھ سے ہی آفاقیت جنم لیتی ہے اور احمد صغیر نے اس رمز کو سمجھ لیا ہے۔ اس لیے وہ ایسی کہانیاں لکھتے ہیں جس سے اردو فکشن کو ایک نیا ڈائمنشن ملے اور ایک ایسا نیا کنوارا تناظر جو دوسروں کے ذہن میں واضح نہ ہو۔ نئے تناظر کی یہ کہانیاں، اردو فکشن کو وسعتوں اور رفعتوں کی نئی منزلیں عطا کریں گی، یہ میرا گمان ہے۔ کیا عجب کہ کبھی یہ گمان، یقین میں بدل جائے——!!

(ایوانِ اردو مارچ ۲۰۰۲)

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری:

احمد صغیر کے موضوعات اوران کا Treatmant بالکل اپنا ہے۔ان کے یہاں زندگی مختلف اشکال میں نظر آتی ہے۔وہ اپنے آس پاس وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے مواد حاصل کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نسل میں کئی دوسروں سے زیادہ ان کے یہاں عصری حسیت کی آ گہی ملتی ہے۔یہ ان کے فن کا ایک خاص وصف ہے۔جہاں تک افسانوں کی بنت کا تعلق ہے تو احمد صغیر کے یہاں تجربے کی کچھ کمی جھلکتی ہے۔ان کی کہانیاں بہتیرے جلد اختتام کی طرف سفر کرتی ہیں اور کہانی منتھنے کا عمل کم ہونے کے سبب افسانہ ایک طے شدہ اختتام تک جا پہنچتا ہے۔

احمد صغیر کے یہاں عصری حسیت اور موضوع کا انتخاب انہیں انفرادیت بخشتا ہے۔اگر وہ کہانیوں میں منتھنے کے عمل کو انگیز کرلیں تو مستقبل ان کا ہے۔

(''کتاب نما'' جنوری ۲۰۰۲)

راشد انور راشد

احمد صغیر نے انا کو بہتر مستقبل کا اشاریہ بنا کر پیش کیا ہے جس کی آمد تڑپتی اور کراہتی انسانیت کو تمام تر دکھوں سے نجات دلائے گی یہ انا کوئی ایک فرد نہیں بلکہ بیشتر دلوں میں احتجاج اور بغاوت کے جو شعلے روشن ہیں' انہیں شعلوں سے ایک نہیں بلکہ ہزاروں انا جنم لیں گے اور تبھی ظلم کی آندھیوں سے نجات ملے گی۔

(نئے افسانے کا معنوی استعارہ)

معراج دعنا

احمد صغیر کی کہانیوں کا بنیادی رجحان بغاوت ہے ان کی تخلیقی کائنات میں احتجاج کا استعارہ بھی نمایاں ہے۔استحصال اور احتجاج کی ضمنی استعارات اپنے بنیادی استعارے کے گرد طواف کرتے نظر آتے ہیں ادب بالخصوص پروٹو ٹائپ ادب کے متعلق یہ بات بڑے اعتماد سے کہی جاتی ہے کہ اس کی اساس بغاوت پر قائم ہوتی ہے۔بغاوت کے لئے ایک فکری نظام کا ہونا بھی اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا کہ احتجاج اور عوامی مظاہرہ۔احمد صغیر کی کہانیوں میں احتجاج بھی ہے اور بغاوت بھی۔

(''استعارہ'' فکشن نمبر)

محمد افضل خان:

احمد صغیر نے دہشت گردی، پولس زیادتی، کلاس وار، جنسی استحصال، ضعیف الاعتقادی، مذہبی دکھاوا، معاشرے کی بے بسی، خوف وسراسیمگی آج کے نظام کی بے حسی اور معاشرے کی کئی دوسری برائیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ——احمد صغیر کے افسانوں کی ایک خوبی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ نہ تو انہوں نے کسی بے جا انقلاب کا نعرہ بلند کیا ہے نہ ہی مہمل علامتوں سے اپنے افسانوں کو ابہام کا شکار ہونے دیا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں کو اپنے اردگرد کے ماحول اور عصر سے قریب رکھا ہے۔

(''کسوٹی جدید'' فروری مارچ ۲۰۰۲)

فیروز عابد:

احمد صغیر کہانی کہنے کا فن جانتے ہیں اور ان کی کہانیوں میں کہانی پن بھی ہے لیکن ان کے یہاں ٹھہراؤ کی کمی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ پوری کہانی ایک سانس میں کہہ دینا چاہتے ہوں۔ احمد صغیر کے افسانوں کے مسائل بالکل زمینی ہیں۔ احمد صغیر سچے فن کار ہیں۔ کہانی کہنا جانتے ہیں اور کہانی کہتے بھی ہیں۔ ان کے فن کارانہ خلوص پر شک کا سوالیہ نشان نہیں لگایا جا سکتا لیکن جب کہانی Very Simplification کے دائرے میں آجائے تو اپنے منصب سے گر جاتی ہے اور پھر وہ طاقت ور نہیں کہلاتی۔

احمد صغیر پس ماندہ طبقے، اقلیت، غریب، ضرورت منداور سیکولر لوگوں کے دوست ہیں۔ وہ ایک صحت مند انقلاب کے علم بردار بھی ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کے ذریعہ ''آج'' کو بیان کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ آج جو بہت کڑوا ہے مگر افسانہ نگار کہیں بھی مستقبل سے مایوس نہیں۔

(''روح ادب'' اپریل تا ستمبر ۲۰۰۲)

فیاض احمد وجیہہ

احمد صغیر کے افسانوی پڑاؤ کا دوسرا تخلیقی سرنامہ ''اناّ کو آنے دو'' میرے پیش نظر ہے۔ اس سے قبل ان کا ایک اور تخلیقی تجربہ ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' چھپ چکا ہے۔ اُردو عالمی گاؤں کے بعض معیاری جرائد ورسائل میں بھی ان کی کہانیاں تواتر سے شائع ہوتی ہیں۔ بلاشبہ احمد صغیر موجودہ منظر نامہ میں اہم ترین نام ہیں۔ حال کے دنوں میں انہوں نے بڑی تیز گامی سے اپنی شناخت مستحکم کی ہے۔ درون مطالعہ انتخاب میں صغیر کا فن کار کہیں کہیں پورے طور پر اپنے رنگ میں موجود ہے تو بعض جگہوں پر فنی رکھ رکھاؤ کی ناکامی کی صورت میں بھی فکری طرفوں کو وا کرنے کی ہنرمندی غیر معمولی ہے۔ اس طور پر مجھے کہنے دیجئے کہ موضوع کا چنتن ہی ان کی فکری سالمیت کا اوّلین وصف ہے۔

ان کا کہانی کار جہاں بھی اپنے رنگ میں نظر آتا ہے وہاں اس بات کا درک بخوبی ہوتا ہے کہ صغیر نے آس پاس کی دنیا پر نگاہ کرتے ہوئے اجتماعی لاشعور کا بے حدا چھوتا اور انوکھا وژن دریافت کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں روایت کی بندھی ٹکی تعریف کی تلاش وجستجو بے معنی ہے۔ اس امر کی نشاندہی کا مدعا بس اتنا ہے کہ احمد صغیر اپنے رنگ کے جنوین کہانی کار ہیں۔ ان کے تخلیقی تجربے کی اساس میں جن باتوں سے سروکار رکھا گیا ہے اس میں انحراف واجتہاد کا آہنگ حیرت انگیز ہے۔ اس طور پر کہنا ہوگا کہ کسی بھی فن کار کے لئے اپنے رنگ میں افسانہ لکھنا بہت سہل نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر بعض لوگ ان کے تجربے میں مابعد جدیدیت کے مضمرات بھی بہ آسانی نمایاں کر سکتے ہیں۔ مگر مجھے کہنے دیجئے کہ صغیر نے نہ کسی نظریہ کے زیر اثر افسانہ لکھا ہے اور نا ہی کسی تھیوری کو اپنے دائرہ کار میں روشن کیا ہے۔ بلکہ امتزاجی صورتوں کے مابین اپنا فنی نشان مرتب کرنے کی سعی کی ہے۔

افسانوں پر تفصیلی بحث کرنے سے قبل یہاں اپنی ایک بات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل ان کا ایک افسانہ ''شکستہ لمحے'' ایوانِ اُردو میں شائع ہوا تھا جس کی قرأت کے بعد راقم الحروف کو یہ کہنے کی سہولت میسر آئی تھی کہ ''احمد صغیر کے افسانے میں معنوی خلاء کے درمیان سے جو واقعہ جھانکتا ہے وہ ان کہی کے طور پر معاشرے کے اس روپ کی دریافت ہے جس کو صرف جنسی عمل سے تعبیر کرنا، نادرست

ہے۔دراصل پدری نظام کے دونمائندہ کرداروں کے بیچ سے ایک تیسری قوت کا جنم لیناہی اس افسانے کا راست پہلو ہے۔اپنے نسائی (نسوانی) کردار کی تربیت میں انہوں نے اجتماعی لاشعور کو انفرادی طور پر برآمد کرکے بھرپور طنز کیا ہے، جوان کےفن کار کے تخلیقی محرکات کو سمجھانے میں غیر معمولی ہے۔'' (ایوانِ اُردو، مارچ ۲۰۰۶ء)

حالاں کہ منقولہ قول کا انطباق متعلقہ متن پر ہی ہوتا ہے۔لیکن صغیر اپنے نسوانی کرداروں کی تربیت جس طور پر کرتے ہیں وہ پیش نظر افسانوں میں بھی افہام وتفہیم کی نئی جہت پیدا کرتی ہے۔اپنے اس خام خیال کی تعبیر وتفہیم میں درونِ مطالعہ چندنکات روشن کرنے کی میری شعوری کوشش بھی ممکن ہے۔

انتخاب کا پہلا افسانہ 'اناّ کو آنے دو' سادہ بیانیہ ہونے کے باوجود کئی جہتوں میں چھلانگ لگا تا ہے گویا کہ Narration کی مکمل تعریف وضع ہوجاتی ہے۔اس کے تلازموں پرغور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ احمد صغیر Viewer-Watcher کے طور پر جنسی تشدد، کر پٹ سسٹم، گاؤں کے سرغنہ کے خلاف حق گوئی کی جرأت اوراس کا دل دہلا دینے والا انجام وغیرہ پرایک معصوم انسان کی نظرکو ترجیح دیتے ہوئے اپنی راہ نکالی ہے۔ظاہر ہے میرے مذکورہ نکات کا انسلاک موضوع سے ہے۔مگراس کی تفہیم میں جایئے تو کہنے کومصر ہونا پڑے گا کہ ان کوفلسفی بننا قطعی پسند نہیں ہے۔آس پاس کی دنیااور ہم عصر سماج کی سچائی پیش کرتے ہوئے صغیر ہرطرح کی مصلحت پسندی کی نفی میں خلاقانہ صلاحیت کا بے انتہا درک رکھتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہاں چھوٹی سچائیاں بھی وسیع ترمفہوم سے ہمکنار ہیں۔پیش نظر متن کی قرأت میں راوی کی جوتصویر ہمارے ذہن میں منعکس ہوتی ہے۔اس کے سہارے احمد صغیر پر بہ آسانی باغیانہ تیور کی مہر ثبت کی جا سکتی ہے۔چنانچہ اس تیور کا مثبت پہلو یہ ہے کہ سماج اور حکومت کی خودساختہ لاقانونیت کودرست یا نادرست گردانا بہت اہم مسئلہ نہیں ہے۔ اسی کے باعث ان کا فن کار اجتماعی لاشعور کی فطری سوچ کو مہمیز کرنے کے لئے اندر کے انسان کی تربیت پر اصرار کرتا ہے۔احمد صغیر کے اس تخلیقی رویےّ کے سبب ہی ان کی باغیانہ فکر انسانی تمکنت کی اصلیت سے ہم آمیز ہوجاتی ہے اوران کی مجموعی آئیڈیالوجی کے ایک اہم عنصر کے طور پر یہ بتلانے میں بھی معاون ہوتی ہے کہ صغیر Outward appearance کا کہانی کار ہوتے ہوئے بھی اپنی پرت In ward appearance میں ہی کھولتے ہیں۔اس طور پر جاناہی چاہئے کہ نکسلائٹ کا عام تصوران کو بے چین کیوں کرتا ہے۔یہاں پرٹھہر کر یہ بھی کہنا چاہئے کہ صغیر نے اپنی بے اطمینانی میں عصری فریسٹریشن کی ایک خاص شکل کونمایاں کرتے ہوئے ایک نمائندہ کردار ''پھلمتیا'' کو پیش کرکے سوالیہ نشان قائم کردیا ہے۔یہاں جاننے والی بات یہ ہے کہ ان کا یہ کردار جنس کے اعتبار سے نسوانی ہی کیوں ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کردار کے حوالے سے ایک الگ بحث درکار ہے۔چوں کہ صغیر کا فکری دائرہ یہاں پرایک ایسے زیروبم کی دریافت کرتا ہے۔جوانسانی سماج کی تعمیر وتشکیل میں بحث کے نئے دریچے بھی واکرتی ہے اوران کی ذہنی زمین کا آئینہ بھی پیش کرتی ہے۔بلا شبہہ احمد صغیر نے اس کردار کی تربیت میں جدید انسان کی گاتھا بیان کی ہے۔دراصل ان کو باطن کی وہ بینائی میسّر ہے جو اپنی روایت کو بھی جانتا ہے اور موجودہ عصر کی تگ وتاز سے بھی واقف ہے اس طور پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ آج کا معصوم مفلس اور ظلم سہنے والا فرد انّا جیسے کردار میں ہی انسان کی نیک نفسی کو کیوں محسوس کرتا ہے۔

ان کا دوسرا افسانہ ''پیاسی ہے زمیں، پیاسا آسمان'' کو بھی بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے چوں کہ احمد صغیر نے دھارمک فلسفہ کی عام ذہنیت کی اساس میں جدید سوسائٹی کی جس طور پر گرہ کشائی کی ہے۔ وہ ان کی ہنرمندی کا چیدہ ثبوت ہے۔ دراصل انسانی جذبوں کو اُجاگر کرتے ہوئے ان کا کردار فوری ردعمل کا بھی عادی ہے اور سکوت کی اس دنیا کا بھی پروردہ ہے جس میں Slice of life کی توانا صورت (احتجاجی شکل) کا مثبت رویہ سامنے چلا آیا ہے۔ معاصر فکشن نگاروں نے مذہبی فلسفہ کا مطالعہ جن عوامل کے درمیان کیا ہے اس کا بے حد روشن پہلو احمد صغیر کو بھی میسر ہے۔ چنانچہ اعلیٰ سوسائٹی کی نمائندہ کردار 'دنشی' کا دوچہرہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ انسان مذہبی آستھا کے دائرے میں اپنا انسانی چہرہ پیش کرنے کے باوجود انسانی برادری کا فرد نہیں گردانا جاسکتا ہے۔ چوں کہ ہمارے آس پاس اپنے خول میں سمٹا ہوا وجود خدائی سماج کا پروردہ ہے۔ اس کی جھوٹی انا پر طنز کرتے ہوئے احمد صغیر نے 'منگی' جیسے کردار کی دریافت کی ہے تو کہنا چاہئے کہ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کو بروئے کار لاتے ہوئے دردمندی اور نیک نفسی کا راگ محض نہیں الاپا ہے۔ بلکہ مندر جاتے ہوئے ممتا کا بیدار ہونا اور لوٹ آنا اس افسانے کا راست واقعہ بھی ہے اور اس انسانی ڈگر کی کھوج بھی، جو مذہب کی بے حد سچی تعریف وضع کرتی ہے۔ بے حد فطری اور سچی تصویر پیش کرتے ہوئے اتنی تہہ داریت پیدا کرنا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ پھر کہنے دیجئے کہ ان کے افسانوں میں معنوی خلاء کے درمیان سے ہی اصل واقعہ جھانکتا ہے۔ اس افسانے میں بھی نسوانی کرداروں کے تعلق سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صغیر کا فکری رویہ واقعات کی بُنت میں عورت کو اتنی اہمیت کیوں دیتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں انسانی نفسیات کو بیان کرنے میں ان کا کہانی کار کسی طور پر دروغ گوئی سے کام لینا نہیں چاہتا۔ اپنے طور پر اس تفہیم کے بعد میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ صغیر کی سادہ بیانی میں سادہ پن کا شائبہ تک نہیں ہے۔

ان کے افسانہ ''اُوور ٹائم'' کو ذہن میں رکھئے تو کہنے میں آسانی ہوجاتی ہے کہ ان کی نگاہ آج کی ہوس پرست سوسائٹی پر بھی ہے۔ حالاں کہ اس موضوع کا انسلاک ہماری روایت سے بھی پورے طور پر ہے۔ چنانچہ ''گلبیا'' جیسی روایتی اور Symbolic کردار کو موجودہ عصر میں جس طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ اس میں بڑی معنی خیزی ہے۔ دراصل واقعات کی بُنت میں آنے والی نسل کی غیر تحفظی کا احساس جس فکری رویےّ پر اصرار ہے۔ اس میں صرف ذات کی نوحہ خوانی نہیں ہے بلکہ پدری نظام کے ایک خاص کردار کی پورے طور پر نفی بھی ہے۔ چوں کہ صغیر لفظیات کے دائرے میں محض واقعہ بیان کرکے یک رُخا پہلو برآمد نہیں کرتے بلکہ سادہ لفظوں میں انسانی قدروں کو اس طور پر اُبھارتے ہیں کہ اپنے آپ ایک نیا افسانہ قاری کے ذہن میں جنم لے لیتا ہے۔ اس طور پر جاننا چاہئے کہ جہاں ایک بات کہہ کر اطمینان حاصل کرلینا بھی صغیر کا وصف ہے وہیں دوسری باتوں کی زمین تیار کردینا ان کا بیحد منفرد تخلیقی حصہ ہے۔

ان کا افسانہ ''جنگ جاری ہے'' پر کچھ بھی عرض کرنے سے قبل یہ بتادینا ضروری جانتا ہوں کہ صغیر اپنی عورتوں کے ذہن کو خوب کریدتے ہیں۔ اس طرح کا جوکھم مول لینا بہت آسان نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کا فن کار اس مرحلے میں بھی بہت کامیاب ہے۔ لیکن دقت طلب امر یہ ہے کہ ان کا افسانہ اپنی اوّل قرأت کے بعد افہام و تفہیم کی جو دنیا آباد کرتی ہے۔ معنیاتی سطح پر اس کی سختی سے نفی بھی کرتی ہے اور اس بات پر شدید اصرار بھی ہے کہ افسانہ وہ نہیں ہے جو لفظوں میں بیان ہوا ہے بلکہ کہانی کی پرت وہاں ہے جہاں کسی کردار کا

ذہنی سفر شروع ہوتا ہے۔اس طور پر کہنا ہوگا کہ اپنی اس ہنر مندی کا اظہار احمد صغیر جب بھی کرتے ہیں ایک نسوانی کردار کو سامنے کر کے اس کی مختلف پرتوں کو نمایاں کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ یہاں پر یہ بات جاننے کی ہے کہ کبھی وہ کردار اپنی پرت در پرت کھوج میں ہوتی ہے تو کبھی کسی خاص سماج کے فرد کی حیثیت سے خود کو نئے انداز سے کھولتی نظر آتی ہے۔ بظاہر احمد صغیر کا بیشتر افسانہ اپنے ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے اکہرے پن کا شکار ہے لیکن افسانہ سے الگ ہونے کے بعد بھی قاری کا ذہنی عمل جاری رہتا ہے۔تو جاننا چاہیے کہ افسانے کی تفہیم ابھی ناتمام ہے۔ حالاں کہ یہ بھی اپنے تمامی پہلو کا ایک خاص حصّہ ہے۔ دراصل یہ احمد صغیر کی ہنر مندی کا وہ پہلو ہے جو پہلے شک وشبہہ میں مبتلا کرتی ہے اور بعد میں تعجب کی دنیا آباد کرتی ہے۔

''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی'' راوی کا دردمند دل جس طور پر موجود ہے وہ صغیر کے بعض ما قابل افسانوں کی فضا بھی ہموار کرتی ہے اور ان کے ذہنی عمل کو بھی پیش کرتی ہے حالاں کہ اس طور پر افسانہ لکھنا بیشتر کہانی کاروں کی فنی اور فکری ناکامی کو ہی سامنے لاتا ہے پھر بھی ان کی ہنر مندی بہتر ڈھنگ سے ظاہر ہوئی ہے۔

''بھگوان کے نام پر'' ان کے سوچ ،فکر کی عمدہ تمثال ہے۔انہوں نے اپنے اس افسانے میں ایک ایسے نسوانی کردار کی دریافت کی ہے۔ جو ہمارے مذہبی سماج کے لئے معمّہ ہے۔اس کے واقعاتی بُنت میں ایک خاص قسم کی پر اسراریت بھی ہے اور ڈرامائی کیف کا ملا جلا آہنگ بھی۔ حالانکہ صغیر کو انسانی سماج کے چند ایسے کردار بھی میسر ہیں جن کی انسانی ہمدردی کا ایک خاص پس منظر ہے۔لیکن اس کا راست پہلو یہ بھی ہے کہ مذہبی فلسفہ میں انسان کی تعریف وضع کرنا جدید معاشرے کے لئے آسان نہیں ہے۔ چنانچہ سائنسی سماج کا مطالعہ انہوں نے بڑے اچھوتے انداز میں کیا ہے۔اپنے اس تخلیقی سرنامے میں صغیر نے اختتامیہ کا ایسا پہلو سامنے کیا ہے جو اپنے آپ میں بے حد Suggesion بھی ہے اور معنیاتی افکار کی جدت بھی۔ میں یہاں پر ٹھہر کر پھر اپنی بات دہرانا چاہتا ہوں کہ صغیر نے بیان کی سادگی کے پیش نظر مفتیان ادب سے پنگا لے لیا ہے۔اس طور پر یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ ان کا افسانہ ہمارے چند ایک اکابر نقادوں کو اپنے قریب پھٹکنے کی اجازت بالکل نہیں دیتا ہے۔

ان کی کہانی ''مریاداور تانڈورقص'' کے واقعاتی پہلو کی اکائی یہ کہنے پر آمادہ کرتی ہے کہ صغیر نے اپنے عصر کی چیدہ نباضی کی ہے۔ اس افسانے کی تشلیث آدمی، ملبہ اور احساس صغیر کے ذہن کی ایسی اختراع ہے جس میں مذہبی جنون کی مختلف جہتیں پورے طور پر روشن ہو گئی ہیں اس طرح کے افسانوں کی قرأت کے بعد کہنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ انہوں نے کسی نظریہ کو اپنا ایمان نہیں جانا ہے بلکہ انسان کی سطح پر اپنے عصر کا مطالعہ کیا ہے۔

''اندھیرے جاگتے ہیں'' کا موضوع آج کی کہانی ہے۔اس موضوع پر معاصر فکشن نگاروں نے بھی اچھی نباضی کی ہے۔لیکن صغیر کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کردار کو فکری کرب عطا کر کے اپنی تربیت کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ ایک کمرے میں سمٹی ہوئی زندگی میں اندھیرے کا جاگنا بھلے ہی عام سی بات ہو۔لیکن پچھلی قدروں کی عجیب سی بے چینی صغیر کی منفرد سوچ کا نتیجہ ہے۔ یہاں بھی ان کا نسوانی کردار دوسرے طور پر درآیا ہے۔

ان کا افسانہ ''سوچ کا کرب'' بڑھتی آبادی کا قصہ ہے۔ بظاہر اس میں مذہبی دقیانوسیت کو اچھالا گیا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے کہانی کار کو صاف طور پر بچالیا ہے ورنہ ان پر بہ آسانی فردیت کا الزام عائد کیا جا سکتا تھا۔ دراصل صغیر نے نئی سوچ کے پروردہ ذہن کے ایک نمائندہ کردار کو راوی کی صورت میں دریافت کرنے کے بعد بھی اپنی غیر معمولی ہنر مندی کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ یہ صغیر کا اتنا بڑا کردار ہے کہ اس کی تلاش میں بہت دور تک بھٹکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صغیر نے اختتامیہ میں ایک نئی زندگی کی آمد کو جس اچھوتے انداز میں روشن کیا ہے اور قاری کے ذہن کو ایک خاص جہت میں منتقل کیا ہے وہ اس بات سے عبارت ہے کہ انسان فطرت کے آگے بہت مجبور ہے۔ ان کی اس تخلیقی ہنر مندی میں ان کا کہانی کار بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ اور شاید یہی اس افسانے کی کامیابی ہے۔

''روشنی بلاتی ہے'' بڑی عامیانہ کہانی ہے۔ اس کے برعکس ''سایہ'' اپنے ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے بڑی عمدہ کہانی ہے۔ صغیر نے یہاں بھی پدری نظام کے موجودہ سماج میں عورت کی خود اعتمادی کو بروئے کار لاتے ہوئے مرد کی کمینگی سے اچھا سروکار رکھا ہے۔ اس طور پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ انہوں نے اپنے مرد کردار کو اپنی تربیت کا ایک موقع بھی کیوں نہیں دیا ہے۔ دراصل صغیر کا اوّلین وصف یہ ہے کہ وہ عورت یا مرد بن کر افسانہ لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ بھی کہنا چاہئے کہ اپنے اندر کی آواز کو گونج بنا کر صغیر کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ یہ ایسی گونج ہے جس کا آہنگ دھیما اور ٹھہرا ہوا ہے۔

پیش نظر مجموعے کی آخری کہانی ''درد بھری زمین'' میں تین لالچی وجود کے درمیان ماں کی تقسیم کا المیہ اپنی کربنا کی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس میں ملک کی سرحد کا تصور بھی اپنی جذباتیت کے ساتھ موجود ہے۔ اپنے موضوع پر لکھی گئی کہانیوں میں یہ بے حد عمدہ کہانی ہے۔

احمد صغیر کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بعض جگہوں پر مایوسی بھی ہاتھ لگی ہے اس کے باوجود ان کی ہنر مندی کو کس طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں یہاں مشورتاً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ احمد صغیر اگر اپنے کرداروں کی زبان اور پس منظر کا خاص خیال رکھیں تو ان کے افسانوں کی فنی اور فکری جہت مزید مستحکم ہو جائے گی۔ ویسے ان کے افسانوں میں جن نسوانی کرداروں سے سابقہ پڑتا ہے وہ صغیر کا مافی الضمیر ہے۔ ان کرداروں کے حوالے سے سماج پر طنز کا پہلو بھی ان کو میسر ہے اور جدید معاشرے میں نئی قوت کے نمو کی فکری جہت بھی۔ اس طور پر کہتا چلوں کہ معاصر فکشن نگاروں میں احمد صغیر کے علاوہ اقبال حسن آزاد، مجیر احمد آزاد اور ثروت خاں وغیرہ کے نسوانی کرداروں پر الگ سے بحث کی جائے تو تانیثیت کی گفتگو میں نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ بہر کیف احمد صغیر کے کہانی کار کی دریافت (میری خوش فہمی) کے باعث مجھے کہنے دیجئے کہ ان کے یہاں ایک ایسا نتھا بالک (کہانی کار) نواس کرتا ہے جو عورت کو زندگی کا استعارہ جانتا ہے۔ شاید اسی لئے انہوں نے اپنی کہانیوں میں عورت کی گاتھا بیان کر کے معاشرے کی دریافت کی ہے۔ یہ معاشرہ ایسا لفظ ہے جس میں صغیر کے تمام موضوعات سمٹ کر آجاتے ہیں ان کے بیشتر افسانے سماجی ہیں لیکن نفسیاتی پہلو کو محو کر کے ان کی تفہیم ادھوری ہوگی۔ میں نے سیاسی لفظ کا استعمال شعوری طور پر نہیں کیا ہے چوں کہ انہوں نے اس کی نئی تعبیر اپنے افسانوں میں متعین کی ہے۔ ان کی بعض ہنر مندی کو ذہن میں رکھئے تو کہنا پڑے گا کہ صغیر اپنے افسانوں میں خارجی حقیقت سے داخلی حقیقت کی طرف سفر کرتے ہیں اور ایک پڑاؤ بنا کر پھر اپنے نکتہ آغاز

کوسامنے کردیتے ہیں۔ان کے تجربوں کی قرأت میں قاری کی تمام توجہ کرداروں کے ذہن وشعور پر مرتکز ہو جاتی ہے۔

●●